اُرُندھتی رائے

تخیل کی موت

(مضامین)

انتخاب اور ترجمہ

اجمل کمال

اُرندھتی رائے

تخیل کی موت

ارُندھتی رائے

تخیل کی موت

(مضامین)

انتخاب اور ترجمہ
اجمل کمال

ارندھتی رائے

تخیل کی موت

(مضامین)

پہلی اشاعت: 2021

زیرِ اہتمام
آج کی کتابیں

سٹی پریس بک شاپ
316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر کراچی 74400
فون: 35650623 (21-92)
ای میل: cpkarachi2020@gmail.com ajmalkamal@gmail.com
ویب سائٹ: www.citypressbooks.com

ترتیب

تخیل کی موت

''ریگستان کانپ اٹھا،'' بھارت سرکار نے ہمیں (اپنے عوام کو) بتایا۔
''پورا پہاڑ سفید ہو گیا،'' حکومتِ پاکستان نے جواب دیا۔

٭

سہ پہر تک پوکھرن کی ہوا خاموش ہو چکی تھی۔ تین بج کر پینتالیس منٹ پر ٹائمر نے تینوں ایٹمی ڈیوائس چلا دیں۔ زمین میں 300 سے 400 میٹر تک گہرائی میں جو حرارت پیدا ہوئی وہ دس لاکھ ڈگری سینٹی گریڈ کے برابر تھی — یعنی اُس درجۂ حرارت کے برابر جو سورج پر پایا جاتا ہے۔ چشم زدن میں ہزاروں ٹن وزنی چٹانیں، گویا سطحِ زمین سے نیچے ایک پوری پہاڑی کے برابر، بخارات میں تبدیل ہو گئیں... دھماکے سے اٹھنے والی زلزلے کی لہروں نے فٹ بال کے میدان کے برابر وسیع ریت کے ٹیلے کو کئی میٹر اوپر اٹھا دیا۔ یہ منظر دیکھ کر ایک سائنسدان نے کہا: ''اب مجھے ان کہانیوں پر یقین آ گیا جن میں بتایا جاتا تھا کہ بھگوان کرشن نے پہاڑی کو اٹھا لیا تھا۔''

(انڈیا ٹوڈے)

مئی 1998۔ اس کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں آئے گا، بشرطیکہ تاریخ کی کتابیں ہوئیں۔

بشرطیکہ ہمارا کوئی مستقبل ہوا۔

نیوکلیئر اسلحے کے بارے میں کہنے کو کوئی نئی یا اوریجنل بات باقی نہیں رہی ہے۔ کسی فکشن نگار کے لیے اس سے زیادہ ذلت آمیز بات کوئی نہیں ہو سکتی کہ اسے وہ باتیں دہرانی پڑیں جو دوسرے لوگ دنیا کے دوسرے لوگ دنیا کے دوسرے حصوں میں نہایت جذبے سے، بڑی وضاحت سے اور اپنے علم کی بنیاد پر، برسوں سے کہتے آ رہے ہیں۔

میں یہ ذلت اٹھانے کو تیار ہوں۔ خود کو عاجزی کے ساتھ سرنگوں کرنے کو تیار ہوں، کیونکہ ان حالات میں خاموشی نا قابلِ مدافعت ہوگی۔ آپ میں سے بھی جو لوگ اس کے لیے تیار ہوں: آیئے ہم اپنے اپنے کردار اٹھائیں، اپنے رد کردہ لباس پہنیں اور اس المناک سیکنڈ ہینڈ کھیل میں اپنے سیکنڈ ہینڈ مکالمے ادا کریں۔ لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اس کھیل پر لگا ہوا داؤ بہت بڑا ہے۔ خود پر تھکن یا شرم طاری کر لینے کا مطلب ہمارا خاتمہ ہوگا۔ ہمارے بچوں کا اور بچوں کے بچوں کا خاتمہ۔ ہر اُس چیز کا خاتمہ جس سے ہمیں محبت ہے۔ ہمیں اپنے اندر رسائی پا کر سوچنے کی قوت حاصل کرنی ہو گی۔ اور لڑنے کی۔

ایک بار پھر ہم وقت سے بہت پیچھے ہیں — نہ صرف سائنس اور ٹیکنالوجی کے اعتبار سے (اس بارے میں کیے جانے والے دعوے بالکل لغو ہیں) بلکہ زیادہ اہم بات یہ کہ ایٹمی اسلحے کے اصل نوعیت کو سمجھ پانے کی نااہلیت کے اعتبار سے۔ ہارر ڈپارٹمنٹ (horror department) کے بارے میں ہماری سمجھ بوجھ افسوسناک طور پر از کار رفتہ ہے۔ ہم لوگ — بھارت اور پاکستان کے رہنے والے تمام لوگ — سیاست اور خارجہ پالیسی کے باریک نکات پر یوں بحث کر رہے ہیں گویا ہماری حکومتوں نے محض ایک نئی قسم کا، پہلے سے زیادہ بڑا، بم تیار کیا ہے، ایک طرح کا بہت بڑا دستی بم جس کی مدد سے وہ اپنے دشمن کو (یعنی ایک دوسرے کو) نیست و نابود کر دیں گی اور ہمیں ہر قسم کے ضرر سے بچا لے جائیں گی۔ ہم کس قدر بے تابی سے اس بات پر یقین کرنا چاہتے ہیں۔ ہم کس قدر قابلِ تعریف، سدھائی ہوئی اور احمق رعایا ثابت ہوئے ہیں۔ باقی بنی نوع انسان (ہاں، ہاں، مجھے معلوم ہے، مگر فی الحال، ہمیں "اُن" کو بھول جانا چاہیے؛ وہ اپنا ووٹ کا حق بہت پہلے گنوا چکے ہیں)، بنی نوع انسان کا بقیہ حصہ شاید ہمیں معاف نہ کرے، مگر بنی نوع انسان کے بقیہ

حصے کو شاید علم ہی نہیں کہ ہم کس قدر دل شکستہ اور مایوس لوگ ہیں۔ اسے شاید اندازہ ہی نہیں کہ ہمیں کسی معجزے کی کس قدر شدید اور فوری ضرورت ہے؛ ہمیں طلسم کی کس قدر سخت آرزو ہے۔

کاش ایسا ہوتا کہ ایٹمی جنگ محض جنگ کی ایک اور قسم ہوتی۔ کاش اس کا تعلق انھی عام طرح کی چیزوں سے ہوتا — قوموں اور ملکوں سے، دیوتاؤں اور تاریخ سے۔ کاش ایسا ہوتا کہ ہم میں سے جو لوگ اس سے دہشت زدہ ہیں وہ محض اخلاقی جرأت سے محروم، بزدل اور نکمے لوگ ہوتے جو اپنے اعتقادات کے دفاع میں جان قربان کرنے کو تیار نہیں۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ اگر ایٹمی جنگ ہوئی تو ہمارا سامنا چین یا امریکہ سے، یا حتیٰ کہ ایک دوسرے سے بھی نہیں ہوگا۔ ہماری دشمنی خود کرۂ ارض سے ہو گی۔ فطرت کے عناصر — آسمان، فضا، زمین، ہوا اور پانی — ہمارے خلاف صف آرا ہو جائیں گے۔ اور ان کا غضب نہایت ہولناک ہوگا۔

ہمارے شہر اور جنگل، ہمارے کھیت اور گاؤں کئی دن تک متواتر جلتے رہیں گے۔ دریا زہر میں تبدیل ہو جائیں گے۔ فضا آگ میں بدل جائے گی۔ ہوا اس آگ کے شعلوں کو دور دور تک پھیلا دے گی۔ جب جلنے کے قابل ہر شے جل چکی ہوگی اور آگ بجھ جائے گی تو دھواں اٹھ کر سورج کو ڈھانپ لے گا۔ زمین پر تاریکی چھا جائے گی۔ پھر دن نہیں نکلے گا۔ کبھی نہ ختم ہونے والی رات شروع ہوگی۔ درجۂ حرارت گر کر نقطۂ انجماد سے نیچے چلا جائے گا اور ایٹمی موسمِ سرما کا آغاز ہو جائے گا۔ پانی زہریلی برف میں تبدیل ہو جائے گا۔ ریڈیو ایکٹو اثرات زمین کی تہوں میں اتر کر سطح کے نیچے پانی کے ذخیروں کو آلودہ کر دیں گے۔ بیشتر زندہ چیزیں — جانور اور نباتات، سمندری اور گھریلو جاندار — مر جائیں گی۔ صرف چوہے اور کاکروچ اپنی نسل بڑھائیں گے اور باقی ماندہ خوراک حاصل کرنے کے لیے باقی ماندہ انسانوں سے مقابلہ کریں گے۔

تب ہم کیا کریں گے — یعنی ہم میں سے وہ لوگ جو اس وقت تک زندہ رہے؟ کھال جلی ہوئی، آنکھیں بینائی سے محروم، بال جھڑے ہوئے اور جسم شدید بیمار، اپنے بچوں کے کینسر زدہ ڈھانچوں کو بازوؤں میں سنبھالے، ہم لوگ کہاں جائیں گے؟ کیا کھائیں گے؟ کیا پییں گے؟ کس ہوا میں سانس لیں گے؟

بھابھا ایٹمی ریسرچ سینٹر، بمبئی، کے صحت، ماحول اور تحفظ کے گروپ کے سربراہ کے پاس

اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے ایک منصوبہ موجود ہے۔ اس نے ایک انٹرویو (دی پائنیر، 24 اپریل 1998) میں اعلان کیا کہ بھارت ایٹمی جنگ سے گزر کر بچ سکتا ہے۔ اس کا مشورہ ہے کہ ایٹمی جنگ ہونے کی صورت میں ہمیں تحفظ کے انھی اقدامات پر عمل کرنا چاہیے جو سائنسدانوں نے ایٹمی پلانٹ پر کسی حادثے کی صورت میں تجویز کیے ہیں۔

آیوڈین کی گولیاں کھائیں — یہ اس کا مشورہ ہے — اور دوسری احتیاطیں کریں، مثلاً باہر نہ نکلیں، کھانے پینے کے لیے صرف ذخیرہ کی ہوئی اشیا استعمال کریں اور دودھ سے پرہیز کریں۔ شیرخوار بچوں کو پاؤڈر کا دودھ دیں۔ "خطرے کے زون میں موجود لوگوں کو چاہیے کہ فوراً گراؤنڈ فلور پر، اور اگر ممکن ہو تو تہہ خانے میں، چلے جائیں۔"

عقل کے فتور کی ایسی منزلوں کے سلسلے میں آپ کیا کر سکتے ہیں؟ ایسی صورت میں آپ کیا کریں گے جب آپ کسی دماغی شفا خانے میں قید ہوں اور ڈاکٹر تمام خطرناک ذہنی مریض ہوں؟

ان باتوں کو نظرانداز کر دیجیے، یہ محض ایک ناول نگار کے جاہلانہ خیالات ہیں — وہ لوگ آپ سے کہیں گے — محض ایک یاسیت پسند ذہن کی مبالغہ آرائی۔ ایسی صورتِ حال کبھی رونما نہیں ہوگی۔ ایٹمی اسلحے کا تعلق جنگ سے نہیں بلکہ امن سے ہے۔ Deterrence ان لوگوں کا پسندیدہ لفظ ہے جو خود کو عقاب (Hawks) سمجھنا پسند کرتے ہیں۔ (عقاب بڑا شاندار پرندہ ہے۔ خنک مزاج۔ ستائش۔ شکار کرنے والا۔ افسوس کہ جنگ کے بعد ان میں سے بیشتر ہلاک ہو چکے ہوں گے۔ Extinction وہ لفظ ہے جس کا ہمیں خود کو کوشش کر کے عادی بنانا ہوگا۔) اس پرانے نظریے کو، کہ ایٹمی اسلحہ جنگ کے راستے میں رکاوٹ ثابت ہوتا ہے، دوبارہ زندہ کیا گیا ہے اور اس میں مقامی رنگ شامل کر کے نئی شکل دی گئی ہے۔ سرد جنگ کو تیسری عالمی جنگ میں بدلنے سے بچانے کا سہرا اس نظریے نے اپنے سر باندھ لیا ہے۔ حالانکہ تیسری عالمی جنگ کے بارے میں صرف ایک بات یقین سے کہی جا سکتی ہے: کہ یہ دوسری عالمی جنگ کے بعد لڑی جانی ہے۔ دوسرے لفظوں میں، اس کا کوئی وقت معین نہیں ہے۔ جس کا مطلب ہے کہ ہمارے پاس اب بھی وقت ہے اور تیسری عالمی جنگ (تھرڈ ورلڈ وار) کی اصطلاح میں "تیسری دنیا" کے لیے جو اشارہ ہے اسے پیشگوئی سمجھنا چاہیے۔ درست، کہ سرد جنگ ختم ہو چکی ہے، لیکن ہمیں ایٹمی اسلحے کے سلسلے میں دس برس کی خاموشی سے دھوکا

نہیں کھانا چاہیے۔ یہ محض ایک ظالمانہ مذاق تھا۔ اس بیماری میں صرف ذرا سا وقفہ آیا تھا؛ اس کا علاج نہیں ہوا تھا۔ دس برس کا یہ وقفہ کسی نظریے کو درست ثابت نہیں کرتا۔ دنیا کی تاریخ میں دس برس کے عرصے کی کیا اہمیت ہے؟ یہ دیکھیے، یہ بیماری پھر ظاہر ہوئی۔ پہلے سے زیادہ وسیع علاقے پر پھیلی ہوئی، اور علاج کو پہلے سے کہیں زیادہ بے اثر ثابت کرنے والی۔ نہیں، اس نظریے میں کہ ایٹمی اسلحہ جنگ کے خلاف رکاوٹ ہے، کچھ نہایت بنیادی نقائص موجود ہیں۔

نقص نمبر ایک یہ ہے کہ اس میں فرض کیا گیا ہے کہ ہمیں اپنے دشمن کی نفسیات کے بارے میں مکمل اور تفصیلی آگہی حاصل ہے۔ ہم فرض کر لیتے ہیں کہ جو چیز (اپنے نیست و نابود ہو جانے کی دہشت) ہمیں جنگ سے باز رکھتی ہے وہ ہمارے دشمن کو بھی جنگ سے باز رکھے گی۔ لیکن اُن لوگوں کے بارے میں کیا خیال ہے جنھیں اس خیال سے دہشت محسوس نہیں ہوتی؟ خودکش بمبار کی سائیکی —یعنی "تم کو ساتھ لے کر مروں گا" والا مکتبِ فکر— کیا کوئی ایسی انوکھی، انہونی چیز ہے؟ یاد نہیں راجیو گاندھی کیسے قتل ہوا تھا؟

پھر یہ بھی سوچیے کہ "ہم" کون ہیں اور "دشمن" کون ہے۔ یہ دونوں سرکاریں ہیں۔ سرکاریں بدل جاتی ہیں۔ وہ نقابوں کے اندر نقابیں پہنتی ہیں۔ وہ کینچلیاں بدلتی اور خود کو نئی صورت دیتی رہتی ہیں۔ مثال کے طور پر اس وقت ہماری جو سرکار ہے اس کے پاس پارلیمنٹ میں اتنی سیٹیں بھی نہیں ہیں کہ وہ اقتدار کا پورا عرصہ گزار سکے، لیکن اس کا مطالبہ یہ ہے کہ ہم اسے ایٹمی اسلحے سے کھیلنے اور کرتب دکھانے کا اختیار دے دیں جبکہ وہ پارلیمنٹ میں محض پیر کا انگوٹھا ٹکائے رکھنے کی جدوجہد میں مصروف ہو۔

نقص نمبر دو یہ ہے کہ اس نظریے کی بنیاد خوف پر ہے۔ لیکن خوف کی بنیاد علم پر ہوتی ہے۔ یعنی ایٹمی جنگ سے باز رہنے کا خوف اس بات پر منحصر ہوگا کہ اس جنگ سے ہونے والی تباہی اور بربادی کی سطح اور وسعت کا درست علم پایا جاتا ہو۔ یہ ایٹمی اسلحے کی کوئی باطنی، پُراسرار خصوصیت نہیں ہے کہ اس سے امن کے خیالات پیدا ہوتے ہوں۔ سرکاروں کو جنگ سے باز رکھنے والی شے ایٹمی اسلحے کا وجود نہیں بلکہ اُن لوگوں کی مسلسل، انتھک اور جرأت مندانہ جدوجہد ہے جو ایٹمی اسلحے کی برسرِعام مخالفت کرتے ہیں، جلوس نکالتے ہیں، مظاہرے کرتے ہیں، فلمیں بناتے ہیں اور اپنے طیش کا اظہار

کرتے ہیں۔ یہ ان لوگوں کی جدوجہد تھی جس نے ایٹمی جنگ کو روکا، یا عارضی طور پر ٹالا۔ اس جہالت اور بے علمی کی موجودگی میں جو ہمارے دونوں ملکوں پر ایک گاڑھے، ٹھوس کہرے کی طرح چھائی ہوئی ہے، ایٹمی اسلحہ جنگ کو روکنے کا ذریعہ ثابت نہیں ہو سکتا۔ (آپ نے مشاہدہ کیا کہ کس طرح وِشو ہندو پریشد پوکھرن کے صحرا کی ریڈیو ایکٹو ریت بھارت بھر میں پرساد کی طرح بانٹنا چاہ رہی تھی۔ شاید اسے ''کینسر یاترا'' کا نام دیا جاتا!) ایسی دنیا میں جہاں ایٹمی جنگ سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کے مقابلے کے لیے آیوڈین کی گولیاں تجویز کی جارہی ہوں، یہ نظریہ کہ ایٹمی اسلحہ جنگ کو روکتا ہے، ایک خطرناک مذاق کے سوا کچھ نہیں ہے۔

بھارت اور پاکستان دونوں کے پاس اب ایٹم بُم موجود ہیں، اور دونوں کے پاس انھیں رکھنے کا جواز بھی موجود ہے۔ بہت جلد اسرائیل، ایران، عراق، سعودی عرب، ناروے، نیپال، (میں ہر طرف سے مثالیں جمع کر رہی ہوں) ڈنمارک، جرمنی، بھوٹان، میکسیکو، لبنان، سری لنکا، برما، بوسنیا، سنگاپور، شمالی کوریا، سویڈن، جنوبی کوریا، ویت نام، کیوبا، افغانستان، ازبکستان... سب کے پاس یہ دونوں چیزیں موجود ہوں گی۔ اور کیوں نہ ہوں؟ دنیا کا ہر ملک اپنا منفرد مقدمہ تیار کر سکتا ہے۔ ہر ملک سرحدیں اور اعتقادات رکھتا ہے۔ اور جس وقت ہم سب ملکوں کے توشہ خانے چمکتے ہوئے، بموں سے بھرے ہوں گے اور ہمارے پیٹ خالی ہوں گے، ہم ان بموں کا سودا کر کے ان کے بدلے میں خوراک حاصل کر سکیں گے۔ اور جب ایٹمی ٹیکنولوجی بازار میں بکنے والی شے بن جائے گی، جب کاروباری مسابقت کے زیرِ اثر اس کی قیمتیں گر جائیں گی، تب یہ محض سرکاروں کی ملکیت نہیں رہے گی بلکہ کوئی بھی شخص یا گروہ جو قیمت ادا کرنے کی استطاعت رکھتا ہو — تاجر، دہشت گرد، شاید کبھی کبھی مالدار ہو جانے والا کوئی ادیب بھی (جیسے میں) — اپنا ذاتی اسلحہ خانہ تیار کر سکے گا۔ ہماری پوری زمین خوبصورت میزائلوں سے جگمگانے لگے گی۔ یہ ایک نیا عالمی نظام ہوگا — نیوک (Nuke) نواز طبقے کی آمریت۔ ہم ایک دوسرے کو دھمکا کر خود کو تسکین دے سکیں گے۔ یہ بالکل بنگی جمپنگ کی طرح ہوگا، جبکہ آپ کو رسّی کی مضبوطی کا اطمینان بھی نہ ہو، یا دن بھر رشین رُولٹ کھیلنے کی طرح۔ ایک اضافی فائدہ یہ ہوگا کہ ہمیں کچھ نہیں معلوم ہوگا کہ کس بات پر یقین کیا جائے۔ ہم گرین کارڈ حاصل کرنے کے متمنی کسی بھی نوسرباز کے وحشیانہ تخیل کا شکار ہو سکیں گے جو مغرب میں پہنچ کر اعلان کر دے

کہ میزائلوں کا حملہ ہونے ہی کو ہے۔ ہم اس امکان پر بھی مسرور ہو سکتے ہیں کہ ہم ہر حقیر ہنگامہ باز یا افواہ طراز کے ہاتھ میں یرغمال رہیں گے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ایسے لوگ جتنے زیادہ ہوں اتنا ہی بہتر ہو گا، کیونکہ اس سے ہمیں اور زیادہ تعداد میں بم تیار کرنے کا بہانہ مل سکے گا۔ تو آپ نے دیکھا، کہ اگر جنگ نہ بھی ہو تو ہماری تواضع کے لیے کیسے کیسے امکانات موجود ہیں۔

لیکن یہاں ہمیں ایک لمحہ رک کر سوچنا چاہیے کہ اس صورتِ حال کا سہرا کس کے سر باندھا جائے۔ ان امکانات کے لیے ہمیں کس کا شکر گذار ہونا چاہیے؟

اُن افراد کا جنھوں نے اس واقعے کو ممکن بنایا۔ جو کائنات کے حکمراں بن بیٹھے ہیں۔ خواتین و حضرات، ریاست ہائے متحدہ امریکہ! ادھر اوپر سٹیج پر چلے آؤ اور جھک کر حاضرین کو آداب کرو۔ دنیا کے ساتھ یہ سلوک کرنے کا شکریہ۔ اپنی اہمیت منوانے کا شکریہ۔ ہمیں یہ راستہ دکھانے کا شکریہ۔ زندگی کے معنی تک بدل ڈالنے کا شکریہ۔

آئندہ سے ہمیں موت سے نہیں، زندگی سے خوفزدہ رہنا ہوگا۔

یہ سوچنا نہایت فاتر العقل لوگوں کا کام ہے کہ ایٹمی اسلحہ صرف اُس وقت مہلک ثابت ہوتا ہے جب اس کا استعمال کیا جائے۔ صرف اس کے ہونے کی حقیقت، ہماری زندگی میں اس کی موجودگی، ایسی قیامتیں برپا کرنے والی ہے جن کا ہمیں ابھی گمان تک نہیں ہوا۔ ایٹمی اسلحہ ہمارے سوچنے کے انداز میں داخل ہو جاتا ہے، ہمارے طرزِ عمل کو کنٹرول کرنے لگتا ہے، ہمارے معاشروں کے خدوخال متعین کرنے لگتا ہے، ہمارے خوابوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ ایٹمی ہتھیار گوشت لٹکانے والے آنکڑوں کی طرح ہمارے دماغوں میں گہرے اتر جاتے ہیں۔ ایٹمی ہتھیار پاگل پن کے پیغامبر ہیں۔ دنیا کے کامیاب ترین نوآبادیات قائم کرنے والے ہیں۔ کسی بھی سفید فام شخص سے کہیں زیادہ۔ سفید پن کا قلبِ ظلمات۔

یہاں بھارت میں —— اور یہاں سے تھوڑی سی دور پاکستان میں —— ہر مرد، عورت اور سائنسدان بچے سے میں صرف اتنا کہہ سکتی ہوں: اسے اپنا ذاتی مسئلہ سمجھیے۔ آپ جو کوئی بھی ہوں —— ہندو، مسلمان، شہری، دیہاتی —— اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ ایٹمی اسلحے کے بارے میں جو واحد اچھی بات کہی جا سکتی ہے وہ یہی ہے کہ یہ انسان کے ذہن میں آنے والا ایسا خیال ہے جو اس قسم کے

ہر فرق کو مسمار کر دیتا ہے۔ جب وہ دن آئے گا تو آپ سے آپ کے ذاتی کوائف نہیں پوچھے جائیں گے۔ تباہی ہر ایک کے لیے یکساں ہوگی۔ اور ایٹم بم آپ کے گھر کے پچھواڑے رکھا ہوا نہیں ہے —— وہ آپ کے جسم کے اندر موجود ہے۔ اور میرے بھی۔ کسی کو —— کسی دیس، کسی سرکار، کسی انسان، کسی خدا کو —— یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ہمارے جسموں کے اندر بم رکھ دے۔ ہم اس بم کے اثر سے ریڈیو ایکٹو ہو چکے ہیں، اور جنگ ابھی شروع بھی نہیں ہوئی ہے۔ اس لیے آپ کو کھڑے ہو کر کچھ نہ کچھ کہنا ہوگا۔ اگر یہ بات پہلے کہی جا چکی ہے تب بھی کوئی حرج نہیں۔ آپ کو اپنی جانب سے یہ بات کہنی ہے۔ یہ آپ کا ذاتی مسئلہ ہے۔

بم اور میں

مئی کے شروع میں (بم سے پہلے) میں تین ہفتے کے لیے باہر گئی۔ میں نے سوچا تھا واپس آؤں گی۔ میرا واپس آنے کا پورا ارادہ تھا۔ ظاہر ہے، واقعات میرے بنائے ہوئے منصوبے کے مطابق پیش نہیں آئے۔

جب میں باہر تھی، میری ملاقات اپنی ایک دوست سے ہوئی جسے میں نے، دوسری وجہوں کے علاوہ، اس بنا پر ہمیشہ عزیز رکھا ہے کہ اس کی ذات میں میرے لیے بے پناہ محبت کے ساتھ ساتھ ایسی صاف گوئی بھی ہے جس کی حدیں سفاکی سے جا ملتی ہیں۔

''میں تمھارے بارے میں سوچتی رہی ہوں،'' اس نے کہا، ''تمھارے ناول کے بارے میں۔ اور جو کچھ اس کے اندر باہر، آگے پیچھے، اوپر نیچے ہے، اس کے بارے میں۔''

پھر وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ میں بہت بے چین تھی اور یقین سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ میں اس کی بات آخر تک سننے کی خواہشمند ہوں۔ لیکن اسے بہر حال یقین تھا کہ وہ اپنی بات آخر تک کہنا چاہتی ہے۔ ''پچھلے ایک برس میں، دراصل ایک برس سے بھی کم عرصے میں، تمھیں ہر چیز بڑی مقدار میں ملی ہے: شہرت، دولت، انعامات، ستائش، تنقید، مذمت، استہزا، محبت، نفرت، غصہ، حسد، فیاضی۔ ایک طرح سے یہ ایک مثالی کہانی ہے۔ اور اپنے مبالغے کے اعتبار سے بیروک آرٹ کا مثالی نمونہ۔ مشکل یہ ہے کہ اس کا مثالی انجام، یا ممکنہ مثالی انجام، صرف ایک ہو سکتا ہے۔'' اس کی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی

تھیں اور ایک خم دار، پُر تجسس چمک سے جھلملا رہی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ میں جانتی ہوں وہ کیا کہنے والی ہے۔ وہ پاگل تھی۔

وہ یہ کہنے والی تھی کہ آئندہ میری زندگی میں جو بھی کچھ ہوگا وہ اس پچھلے ایک برس کی چمک دمک کے جوڑ کا نہیں ہوگا۔ کہ میری بقیہ زندگی مبہم طور پر غیر اطمینان بخش گزرے گی۔ چنانچہ اس کہانی کا واحد مثالی انجام موت ہے۔ میری موت۔

یہ خیال میرے ذہن میں بھی آ چکا تھا۔ سچ مچ آ چکا تھا۔ یہ حقیقت کہ یہ سب کچھ، یہ تمام بین الاقوامی چہل پہل —— میری آنکھوں میں چمکتی روشنیاں، حاضرین کی داد، پھول، فوٹوگرافر، اخبار نویس (یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ انھیں میری زندگی سے گہری دلچسپی ہے، اس کے باوجود کسی ایک بات کو بھی درست بیان کرنے کے سلسلے میں سخت مشکل سے دوچار)، میرے اردگرد منڈلاتے ہوئے سوٹ پہنے مرد، ہوٹلوں کے چمکدار باتھ روموں میں تولیوں کی ختم نہ ہونے والی قطاریں —— یہ سب کچھ دوبارہ ہونے والا نہیں تھا۔ کیا مجھے اس چہل پہل کی کمی محسوس ہوگی؟ کیا میں اس کی عادی ہو چکی ہوں؟ کیا مجھے شہرت کا نشہ چڑھ چکا ہے؟ کیا یہ نشہ ٹوٹنے پر مجھے تکلیف ہوگی؟

جتنا زیادہ میں اس بارے میں سوچتی رہی، اتنا ہی مجھ پر واضح ہوتا گیا کہ اگر شہرت میری مستقل صورتِ حال بن گئی تو یہ مجھ کو مار ڈالے گی۔ اپنی شائستگی اور صاف ستھرے پن سے مجھے ہلاک کر دے گی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے پانچ منٹ کے لیے اپنی اس شہرت کا بہت لطف اٹھایا، لیکن اس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ اس کا دورانیہ محض پانچ منٹ کا تھا۔ کیونکہ میں جانتی تھی (یا میرا خیال تھا کہ میں جانتی ہوں) کہ جب میں اس سے اُکتا جاؤں گی تو اٹھ کر گھر چلی جاؤں گی اور اس کے بارے میں سوچ کر شرارت سے ہنسوں گی۔ بوڑھی اور غیر ذمے دار ہو جاؤں گی۔ چاندنی رات میں بیٹھ کر آم کھاؤں گی۔ چند ایک نہایت ناکام کتابیں لکھوں گی —— ورسٹ سیلرز —— اور دیکھوں گی کہ یہ کیسا لگتا ہے۔ پورے ایک برس میں دنیا بھر میں پھرتی رہی ہوں لیکن میرے ذہن کا لنگر اپنے گھر کے خیال سے بندھا رہا ہے، اُسی زندگی میں واپس آنے کے خیال سے۔ بیرونِ ملک جا بسنے کے بارے میں تمام استفسارات اور پیش گوئیوں کے برعکس، یہی میرا کنواں ہے جس کے پانی پر میں جیتی ہوں، جو میری طاقت ہے۔

میں نے اپنی دوست کو بتایا کہ مثالی کہانی نام کی کوئی شے نہیں ہوتی۔ میں نے کہا کہ وہ چیزوں کو باہر سے دیکھ رہی ہے، اور یہ اس کا مفروضہ ہے کہ میری مسرت، یا تسکین کا گراف صرف اس بنا پر اچانک بلند ہو گیا ہے (اور اب اسے لازماً نیچے آنا ہوگا) کہ مجھے اچانک ''کامیابی'' حاصل ہو گئی ہے۔ اس مفروضے کی بنیاد اس غیر تخیلی اعتقاد پر ہے کہ دولت اور شہرت ہر شخص کے خوابوں کا لازمی جز ہوتے ہیں۔

تم ضرورت سے زیادہ طویل عرصے سے نیویارک میں رہ رہی ہو، میں نے اس سے کہا۔ اس کے علاوہ دوسری دنیائیں بھی موجود ہیں۔ دوسری قسم کے خواب بھی ہوتے ہیں۔ ایسے خواب جن میں ناکامی بھی قابلِ قبول اور باعزت شے ہے — کبھی کبھی تو ایسی شے جس کے لیے جدوجہد کی جا سکتی ہے۔ ایسی دنیائیں جن میں تسلیم کر لیا جانا ذہانت یا انسانی قدر و قیمت کا واحد پیمانہ نہیں ہوتا۔ بہت سے سورما ہیں جن سے میں واقف ہوں اور محبت کرتی ہوں، ایسے لوگ ہیں جو مجھ سے کہیں زیادہ قابلِ قدر ہیں، جو ہر صبح اپنی جنگ پر نکلتے ہیں، یہ جانتے ہوئے کہ اس جنگ میں انھیں شکست ہوگی۔ درست، کہ 'کامیابی' کے فحش ترین مفہوم کے اعتبار سے وہ کم کامیاب ہیں، لیکن ذاتی طور پر کسی بھی طرح کم مطمئن نہیں۔

میں نے اسے بتایا کہ وہ واحد خواب جس کے لیے زندگی گزاری جا سکتی ہے یہ ہے کہ جب آپ زندہ ہوں تو پوری طرح زندہ ہوں اور جب مریں تو صرف اس وقت جب موت آ جائے۔ (یہ شاید ایک طرح کی پیش آگہی تھی۔)

''اس بات کا کیا مطلب ہوا؟'' (بھنویں چڑھی ہوئی، انداز میں ایک طرح کی جھنجھلاہٹ۔)

میں نے وضاحت کرنے کی کوشش کی لیکن ٹھیک طرح نہ کر سکی۔ کبھی کبھی مجھے سوچنے کے لیے لکھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ چنانچہ میں نے اپنی بات پیپر نیپکن پر لکھ کر اسے سمجھائی۔ میں نے لکھا: ''محبت کرنا۔ محبت پانا۔ اپنے غیر اہم ہونے کو کبھی نہ بھلانا۔ اپنے اردگرد کی زندگی کی ناقابلِ بیان بربریت اور فحش نابرابری سے کبھی سمجھوتہ نہ کرنا۔ غمناک ترین جگہوں میں خوشی کو تلاش کرنا۔ حسن کا اس کی کھوہ تک پیچھا کرنا۔ سادہ شے کو پیچیدہ بنانے اور پیچیدہ شے کو سادہ بنانے سے ہمیشہ پرہیز کرنا۔

قوت کا احترام کرنا اور طاقت کا احترام نہ کرنا۔ سب سے بڑھ کر، اپنی آنکھیں کھلی رکھنا۔ سمجھنے کی کوشش کرنا۔ حقیقت سے نظریں نہ پھیرنا۔ اور ہرگز، ہرگز کبھی نہ بھولنا۔''

میں اپنی اس دوست سے برسوں سے واقف ہوں۔ وہ بھی میری طرح آرکیٹیکٹ ہے۔

وہ شک میں لگتی تھی، اسے میری اس بیپر نیپکن کی تقریر سے اطمینان نہیں ہوا تھا۔ میں اس کی کہی ہوئی بات کو اس کی ساخت سے، چیزوں کے نفیس، بیانیہ تناسب کے ذریعے پہچان سکتی تھی۔ چونکہ اسے مجھ سے محبت تھی، میری 'کامیابی' پر اس کا جوش وخروش اس قدر سچا، اتنا پیار بھرا تھا کہ اس کا مخالف نقطہ صرف میری (متوقع) موت کے خیال سے پیدا ہونے والی دہشت ہی ہو سکتا تھا۔ میں نے سمجھ لیا کہ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ یہ صرف ڈیزائن کے تناسب کی بات ہے۔

خیر، اس گفتگو کے دو ہفتے بعد میں بھارت لوٹ آئی۔ یعنی اس جگہ جسے میں گھر سمجھتی ہوں/سمجھتی تھی۔ موت ضرور واقع ہوئی مگر میری نہیں؛ مجھ سے کہیں زیادہ قیمتی شے کی۔ ایک ایسی دنیا کی جو کچھ عرصے سے بیمار چلی آ رہی تھی اور جس نے آخرکار دم توڑ دیا۔ اب اسے نذرِ آتش کیا جا چکا ہے۔ فضا بدصورتی سے بوجھل ہو رہی ہے اور ہوا سے فاشزم کی تیکھی بو آ رہی ہے۔

ہر روز اخباروں کے اداریوں میں، ریڈیو کے پروگراموں میں، ٹی وی کے ٹاک شوز میں، یہاں تک کہ ایم ٹی وی پر بھی، وہ لوگ جن کی جبلت پر کبھی بھروسا کیا جا سکتا تھا — ادیب، مصور، صحافی — سڑک پار کر کے دوسری طرف جاتے دکھائی دے رہے ہیں۔ ٹھنڈ میری ہڈیوں تک اتر جاتی ہے جوں جوں روزمرہ زندگی سے حاصل ہونے والے سبق اس دردناک حقیقت کو واضح کرتے جاتے ہیں کہ تاریخ کی کتابوں میں جو کچھ پڑھا تھا وہ سچ نکلا۔ کہ فاشزم کا تعلق جتنا سرکاروں سے ہے اتنا ہی عام لوگوں سے بھی ہے۔ کہ فاشزم کا آغاز اپنی ذات سے، اپنے گھر سے ہوتا ہے۔ گھر کے ڈرائنگ روم سے، بیڈروم سے، بستر سے۔ ''خودشناسی کا دھماکا''، ''قومی احیا کا راستہ''، ''فخر کا لمحہ'' — یہ وہ سرخیاں تھیں جو ایٹمی آزمائشوں کے بعد کے دنوں میں اخباروں کی پیشانیوں پر نمودار ہوئیں۔ ''ہم نے ثابت کر دیا ہے کہ ہم اب ہیجڑے نہیں ہیں،'' شیوسینا کے شری بال ٹھاکرے نے کہا۔ (مگر یہ کس نے کہا تھا کہ ہم ہیجڑے ہیں؟ یہ درست ہے کہ ہم میں ایک بہت بڑی تعداد عورتوں کی ہے مگر جہاں تک مجھے علم ہے، یہ بالکل دوسری بات ہے۔) اخبار پڑھتے ہوئے کبھی کبھی تو یہ تمیز کرنا مشکل ہو جاتا

ہے کہ کب کوئی شخص مردانگی کی دوا ویاگرا کی بات کر رہا ہے (جو اخبار کے پہلے صفحوں پر دوسرا ممتاز ترین مقام پانے کی کوشش کر رہی تھی) اور کب بم کے بارے میں۔ ''ہمارے پاس زیادہ طاقت ہے۔'' (یہ ہمارے وزیرِ دفاع کا بیان تھا جو پاکستانی ایٹمی آزمائشوں کے بعد دیا گیا۔)

''یہ ایٹمی آزمائشیں نہیں ہیں، یہ قومی آزمائشیں ہیں،'' ہمیں بار بار بتایا گیا۔

یہ بات متواتر دہرائی جاتی رہی ہے: بم بھارت ہے، بھارت بم ہے۔ اور محض بھارت نہیں، ہندو بھارت۔ اس لیے خبردار! بم پر تنقید نہ صرف قوم مخالف بلکہ ہندو مخالف بھی ہوگی۔ (پاکستان میں، بلاشبہ، بم اسلامی بم ہے۔ اس ایک فرق کے سوا، سب کچھ، طبیعیات کے اصولوں کے مطابق، وہی ہے۔) یہ ایٹم بم کا مالک ہونے کا ایک اضافی، غیر متوقع فائدہ ہے۔ اس سے سرکار نہ صرف ''دشمن'' کو دھمکا سکے گی بلکہ خود اپنے عوام کے خلاف بھی اعلانِ جنگ کر سکے گی۔ یعنی ہمارے خلاف۔

1975 میں، جب بھارت کو ایٹمی سمندر کے پانی میں اپنے پیر کا انگوٹھا پہلی بار ڈبوئے صرف ایک برس گزرا تھا، مسز گاندھی نے ایمرجنسی نافذ کر دی تھی۔ 1999 میں کیا ہونے والا ہے؟ ایسے سیل قائم کرنے کی بات تو ابھی سے ہونے لگی ہے جو قوم دشمن سرگرمیوں پر نگاہ رکھیں گے۔ کیبل ٹی وی سے متعلق قوانین میں ترمیم کی بات ہو رہی ہے تاکہ ان نیٹ ورکس پر پابندی لگائی جا سکے جو ''قومی مفاد کو نقصان پہنچا رہے ہیں''، (انڈین ایکسپریس، 3 جولائی۔) گرجا گھروں کو عبادت گاہوں کی فہرست سے خارج کیے جانے کی باتیں ہو رہی ہیں کیونکہ وہاں ''شراب پیش کی جاتی ہے''، (اعلان اور تردید، انڈین ایکسپریس، 3 جولائی، اور ٹائمز آف انڈیا، 4 جولائی۔) مصوروں، ادیبوں، اداکاروں اور گلوکاروں کو پریشان کیا جا رہا ہے، دھمکیاں دی جا رہی ہیں (اور وہ دھمکیاں قبول کر رہے ہیں)۔ اور یہ سب کرنے والے صرف غنڈوں کے گروہ نہیں بلکہ ریاست کے ادارے بھی ہیں۔ یہ باتیں قانون کی عدالتوں میں پیش آ رہی ہیں۔ انٹرنیٹ پر خطوط اور مضامین منتشر کیے جا رہے ہیں جن میں نوسٹراڈیمس کی پیش گوئیوں کی تخلیقی تعبیر کرتے ہوئے یہ بتایا جا رہا ہے کہ ایک طاقتور اور فاتح ہندو قوم اُبھرنے کو ہے۔ ایک نیا بھارت وجود میں آ رہا ہے جو ''اپنے سابق حکمرانوں پر حملہ آور ہوگا اور انھیں مکمل طور پر نیست و نابود کر دے گا۔'' کہ ''اس ہولناک انتقام کا آغاز (جو تمام مسلمانوں کا انجام

ثابت ہوگا)1999 کے ساتویں مہینے میں ہوگا۔'' ممکن ہے کہ یہ باتیں محض کسی اکیلے بیمار شخص کے ذہن کی پیداوار ہوں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے پیچھے دھرم کے لیے لڑنے والوں کا کوئی سکواڈ ہو۔ لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ ایٹمی اسلحے کی موجودگی ان خیالات کو بظاہر امکانات کا درجہ دے دیتی ہے۔ ایٹمی اسلحے کی موجودگی ایسے خیالات کو جنم دے سکتی ہے۔ یہ لوگوں کے دماغوں میں اپنی طاقت کے یہ انتہائی غلط، انتہائی مہلک خیالات پیدا کرتی ہے۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ کاش میں کہہ سکتی کہ یہ سب ''سست رفتاری سے لیکن یقینی طور پر'' ہو رہا ہے، مگر میں یہ الفاظ استعمال نہیں کرسکتی۔ اس کی رفتار تو بہت تیز ہے۔

یہ سب کچھ اتنا مانوس کیوں لگ رہا ہے؟ اس لیے کہ آپ کے دیکھتے ہی دیکھتے سامنے کی حقیقت گھل کر نہایت روانی سے پرانی فلموں کے خاموش، بلیک اینڈ وائٹ مناظر میں ڈھل جاتی ہے جن میں لوگوں کو جمع کر کے انبوہ کی شکل میں ہانک کر کیمپوں کی طرف لے جایا جا رہا ہے۔ ہلاکتوں کے مناظر۔ غارت گری کے مناظر۔ ٹوٹے ہوئے لوگ، طویل، ختم نہ ہونے والی قطاروں میں اپنی موت کی طرف بڑھتے ہوئے۔ ان فلموں میں کوئی ساؤنڈ ٹریک کیوں نہیں ہے؟ ہال میں اس قدر خاموشی کیوں ہے؟ کیا ہم پچھلے دنوں بہت فلمیں دیکھتے رہے ہیں؟ کیا میں پاگل ہو چکی ہوں؟ یا میری بات درست ہے؟ کیا جس چیز کو ہم نے حرکت دی ہے اس کا ناگزیر انجام ایسے ہی مناظر پر ہوگا؟ کیا ہمارا مستقبل پھیل کر تیزی سے ہمارے ماضی کی جانب بڑھ رہا ہے؟ میرا خیال ہے، ہاں۔ سوائے اس کے کہ ایٹمی جنگ ایک ہی آن میں سب کچھ فنا کردے۔

جب میں نے اپنے دوستوں سے ذکر کیا کہ میں یہ مضمون لکھ رہی ہوں تو انھوں نے مجھے خبردار کیا۔ ''ٹھیک ہے، لکھو،'' انھوں نے کہا، ''مگر پہلے دیکھ لو کہ تمھیں کوئی خطرہ نہ ہو۔ دیکھ لو کہ تمھارے سب کاغذات درست ہیں۔ کہ تم نے ٹیکس پورا ادا کر رکھا ہے۔''

میرے سب کاغذات درست ہیں۔ میں نے ٹیکس بھی پورا ادا کر رکھا ہے۔ لیکن جیسا ماحول ہے اس میں کوئی شخص خطرے میں نہ ہونے کا یقین کیونکر کرسکتا ہے؟ ہر شخص خطرے میں ہے۔ کبھی بھی کوئی حادثہ ہوسکتا ہے۔ تحفظ صرف سر جھکا دینے میں ہے۔ یہ سطریں لکھتے ہوئے بھی مجھے خطرے کا احساس ہو رہا ہے۔ اس ملک میں میں نے پوری طرح جان لیا ہے کہ کسی ادیب کے لیے شدید محبت

(اور کسی حد تک نفرت) کا مرکز بنا کیا معنی رکھتا ہے۔ پچھلے سال میں ان چیزوں میں شامل تھی جنھیں سال کے آخر میں قومی افتخار کی پریڈ میں میڈیا نے سب کے سامنے پیش کیا تھا۔ میرے علاوہ، مجھے فنا کرنے کے لیے، اس پریڈ میں ایک بم بنانے والا تھا اور ایک بین الاقوامی ملکۂ حسن تھی۔ ہر بار جب کوئی خوشی سے دمکتا ہوا شخص مجھے راستے میں روک کر کہتا کہ "آپ نے بھارت کا سر فخر سے بلند کر دیا ہے" (اس کا اشارہ اس کتاب کی طرف نہیں ہوتا تھا جو میں نے لکھی بلکہ اس انعام کی طرف جو مجھے حاصل ہوا)، تو مجھے کچھ بے چینی سی محسوس ہوتی تھی۔ اس وقت مجھے اس بات سے تھوڑا سا ڈر لگتا تھا اور اب میں پوری طرح دہشت زدہ ہوں، کیونکہ میں جانتی ہو کہ اس فخر، جذبے کے اس ابھار کا رخ کتنی آسانی سے میرے خلاف ہو سکتا ہے۔ شاید اس کا وقت بھی آ گیا ہے۔ اب مجھے خواب ناک روشنیوں سے باہر آنا ہے اور صاف صاف وہ بات کہنی ہے جو میرے ذہن میں ہے۔

جو یہ ہے:

اگر اس بم کے خلاف احتجاج کرنا جسے میرے دماغ کے اندر رکھ دیا گیا ہے، ہندو مخالف اور قوم دشمن بات ہے تو میں اپنے جرم کا اقبال کرتی ہوں۔ میں اپنی ذات کو ایک آزاد اور چلتی پھرتی جمہوریہ قرار دیتی ہوں۔ میں اس کرۂ ارض کی شہری ہوں۔ میں کسی خطۂ ارض کی مالک نہیں ہوں۔ میرا کوئی پرچم نہیں ہے۔ میں عورت ہوں، لیکن مجھے ہیجڑوں سے بھی کوئی کد نہیں ہے۔ میری پالیسیاں بالکل سادہ ہیں۔ میں ایٹمی اسلحے کے عدم پھیلاؤ اور ایٹمی آزمائشوں پر پابندی لگانے کے ہر اس معاہدے پر دستخط کرنے کو تیار ہوں جو دستخط کے لیے موجود ہو۔ میں نقل مکانی کر کے آنے والوں کو خوش آمدید کہتی ہوں۔ آپ لوگ میرے پرچم کا ڈیزائن تیار کرنے میں میری مدد کر سکتے ہیں۔

میری دنیا ختم ہو چکی ہے۔ اور میں اس کی موت کا نوحہ لکھ رہی ہوں۔

مجھے اعتراف ہے کہ یہ ایک ناقص دنیا تھی۔ اس میں باقی رہنے کی صلاحیت نہ تھی۔ اس کے بدن پر پرانے اور تازہ زخم تھے۔ یہ ایک ایسی دنیا تھی جس پر میں نے بھی سفاکی سے تنقید کی تھی، لیکن صرف اس لیے کہ مجھے اس سے محبت تھی۔ یہ موت کی حقدار نہیں تھی۔ ٹکڑے ٹکڑے کیے جانے کی مستحق نہیں تھی۔ مجھے معاف کر دیجیے، مجھے احساس ہے کہ جذباتیت فیشن کے خلاف ہے — مگر میں اپنے

اندوہ کا کیا کروں؟

مجھے اس دنیا سے محبت تھی، صرف اس لیے کہ وہ انسانیت کو انتخاب کا موقع دیتی تھی۔ وہ ساحلِ سمندر پر ایک چٹان کی طرح تھی۔ وہ روشنی کی ایک ضدی شعاع تھی جو بار بار جتاتی تھی کہ زندہ رہنے کا ایک اَور، مختلف طریقہ بھی موجود ہے۔ وہ جوں توں چلتے ہوئے امکانات کی دنیا تھی۔ وہ انتخاب کا سچ مچ کا امکان تھی۔ اب یہ سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔ بھارت کی ایٹمی آزمائشیں، اور جس انداز میں یہ آزمائشیں کی گئیں، اور جس طرح (ہم نے) خوشیاں منا کر ان کا سواگت کیا—یہ سب ناقابلِ دفاع ہے۔ میرے نزدیک یہ سب دہشت کی نشانیاں ہیں۔ یہ تخیل کی موت کا اشارہ ہے۔ جو درحقیقت آزادی کی موت ہے، کیونکہ آزادی کا یہی تو مفہوم ہے: انتخاب کی آزادی۔

پچھلے سال 15 اگست کو ہم نے بھارت کی آزادی کی پچاسویں سالگرہ منائی تھی۔ اگلے سال مئی میں، ہم خود کو ایٹمی غلامی میں دے دینے کی سالگرہ منا سکیں گے۔

ایسا کیوں کیا گیا؟

سیاسی موقع پرستی اس کا ایک سامنے کا اور کلبیت زدہ جواب ہے۔ مگر اس سے ایک اَور، زیادہ بنیادی، سوال پیدا ہوتا ہے۔ سیاسی موقع پرستی نے اسے اپنے لیے کارآمد کیوں سمجھا؟

سرکاری طور پر پیش کی گئی تین وجوہات یہ ہیں: (1) چین، (2) پاکستان، اور (3) مغرب کی منافقت کی پردہ دری۔

اگر انھیں جوں کا توں مان کر ایک ایک کر کے پرکھا جائے تو یہ تینوں وجوہات کسی حد تک چکرا دینے والی ہیں۔ میں ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں کہہ رہی ہوں کہ یہ تینوں حقیقی اِشوز نہیں ہیں۔ میں صرف یہ کہہ رہی ہوں کہ ان میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہمارے پرانے افق پر نئی بات صرف ایک ہے، اور وہ ہے بھارت کی موجودہ سرکار۔ ہمارے وزیرِ اعظم نے بیزار کن حد تک بناوٹی انداز میں امریکی صدر کے نام اپنے خط میں لکھا (اگر یہی کچھ لکھنا تھا تو خط لکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟) کہ ایٹمی آزمائشیں کرنے کے بھارت کے فیصلے کی وجہ "سلامتی کی بگڑتی ہوئی صورتِ حال" تھی۔ آگے چل کر اس خط میں چین کے ساتھ 1962 کی جنگ کا ذکر کیا گیا اور کہا گیا کہ "پچھلے پچاس سال میں ہمیں

تین بار (پاکستان کی طرف سے) جارحیت کا سامنا کرنا پڑا۔ اور پچھلے دس سال سے ہم... خاص طور پر جموں اور کشمیر میں... دہشت گردی اور مسلح بغاوت کا سامنا کر رہے ہیں جسے اُس کی پشت پناہی حاصل ہے۔"

چین کے ساتھ جنگ پینتیس برس پرانی بات ہو چکی۔ سوائے اس کے کہ اس کے برعکس کسی بات کو ریاستی راز کی طرح ہم سے چھپایا جاتا رہا ہو، ہمارا تو یہی اندازہ ہے کہ دونوں ملکوں کے تعلقات کسی قدر بہتر ہوئے ہیں۔ ایٹمی آزمائشوں سے چند روز پہلے چین کی پیپلز لبریشن آرمی کے چیف آف اسٹاف جنرل فُو کوان یو بھارتی چیف آف آرمی سٹاف کے مہمان تھے۔ ہم نے جنگ کا پتا دینے والی کوئی آوازیں نہیں سنیں۔

پاکستان کے ساتھ تازہ ترین جنگ ستائیس برس پہلے لڑی گئی تھی۔ ہاں، کشمیر میں یقیناً سخت اضطراب کا ماحول ہے اور بلاشبہ پاکستان شعلوں کو خوش ہو ہو کر ہوا دے رہا ہے۔ لیکن شعلوں کو ہوا دینے کے لیے یہ بھی تو ضروری ہے کہ شعلوں کا وجود ہو۔ لکڑیاں چیخ رہی ہیں اور جلنے کو تیار ہیں۔ کیا بھارتی ریاست ذرا بھی ایمانداری کے ساتھ خود کو کشمیر کی صورتِ حال سے بری الذمہ قرار دے سکتی ہے؟ کشمیر ہی نہیں، آسام، تری پورہ، ناگالینڈ —— پورا شمال مشرقی خطہ —— جھاڑ کھنڈ، اُترا کھنڈ، اور آگے چل کر پیش آنے والے دوسرے مسائل، یہ سب کسی گہرے مرض کی علامات ہیں۔ اور اس مرض کو ایٹمی میزائلوں کا رخ پاکستان کی طرف کر کے حل نہیں کیا جا سکتا۔

پاکستان کے مسئلے کو بھی ایٹمی میزائلوں کا رخ پاکستان کی طرف کر کے حل نہیں کیا جا سکتا۔ بے شک ہم الگ الگ دیس ہیں، لیکن ہمارے آسمان، ہماری ہوائیں، ہماری ندیاں مشترک ہیں۔ کسی خاص دن ایٹمی دھماکے سے ہونے والے اثرات کہاں تک پہنچیں گے، اس کا انحصار اُس دن چلنے والی ہوا کے رخ اور بارش پر ہوگا۔ لاہور اور امرتسر میں محض تیس میل کا فاصلہ ہے۔ اگر ہم نے لاہور پر بم گرایا تو پورا پنجاب آگ کی لپیٹ میں آ جائے گا۔ اگر کراچی پر بم گرایا تو گجرات اور راجستھان —— بلکہ بمبئی بھی —— جل اٹھے گا۔ پاکستان کے خلاف کسی ایٹمی جنگ کا مطلب خود اپنے خلاف جنگ ہوگا۔

جہاں تک سرکاری طور پر بیان کیے جانے والے تیسرے سبب —— مغربی منافقت کی پردہ

دری ـــــ کا تعلق ہے، اس کی مزید پردہ دری کیسے ممکن ہے؟ دنیا کے کس معقول آدمی کو اس باب میں کسی قسم کا شک ہے؟ مغرب کی قوموں کی تاریخ دوسروں کے خون سے سفنج کی طرح بھری ہوئی ہے۔ نوآبادیت، نسلی تفریق، غلامی، نسلی صفایا، جراثیم کی جنگ، کیمیائی اسلحہ ـــــ یہ سب انھی کی ایجاد ہیں۔ انھوں نے قوموں کو تاخت و تاراج کیا، تہذیبوں کو تباہ کیا، پوری پوری انسانی آبادیوں کو ہلاک کیا۔ وہ لوگ دنیا کے سٹیج پر بالکل ننگے، لیکن ہر قسم کی شرم سے عاری، کھڑے ہیں، کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ان کے پاس دنیا میں سب سے زیادہ دولت، سب سے زیادہ غذا اور سب سے بڑے بم ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر وہ چاہیں تو ہم سب کو ایک عام دن کے اوقاتِ کار کے اندر اندر مٹا ڈالیں۔ میرا تو خیال ہے مغرب کے طرزِ عمل کو منافقت نہیں بلکہ دیدہ دلیری کہنا چاہیے۔

ہمارے پاس کم دولت اور کم غذا ہے اور ہمارے بم بھی ان کے مقابلے میں چھوٹے ہیں۔ لیکن ہمارے پاس دوسری ہر طرح کی دولت ہے ـــــ مسرت سے بھرپور، شمار نہ کی جانے والی دولت۔ ہم نے اپنی اس دولت کے ساتھ جو کچھ کیا ہے وہ ہمارے خیال کے بالکل برعکس ہے۔ ہم نے اس کو گروی رکھ دیا ہے۔ اس کو بیچ ڈالا ہے۔ اور کون سی شے حاصل کرنے کے لیے؟ ٹھیک ان لوگوں کے ساتھ ایک معاہدے میں شریک ہونے کے لیے جن سے نفرت کا ہم دعویٰ کرتے ہیں۔ وسیع نظر سے دیکھا جائے تو ہم انھی کا کھیل، انھی کے بتائے ہوے طریقے سے کھیلنے پر رضامند ہو گئے ہیں۔ ہم نے ان کی شرائط اور کھیل کے قواعد کسی چوں چرا کے بغیر مان لیے ہیں۔ سی ٹی بی ٹی پر دستخط کرنا تو اس کے مقابلے میں کچھ حیثیت ہی نہیں رکھتا۔

مجموعی طور پر، میرے خیال سے یہ کہنا درست ہوگا کہ منافق ہم خود ہیں۔ ہم وہ لوگ ہیں جنھوں نے ایک ایسا موقف ترک کر دیا جسے کسی طرح اخلاق پر مبنی کہا جا سکتا تھا: یہ کہ ہمارے پاس ٹیکنالوجی ہے، اگر ہم چاہیں تو بم بنا سکتے ہیں، لیکن ہم بم نہیں بنائیں گے، کیونکہ ہم بموں پر یقین نہیں رکھتے۔

ہم وہ لوگ ہیں جنھوں نے اب اپنی اس بےتاب تمنا کا اظہار کر دیا ہے کہ ہمیں بھی سپر پاور ملکوں کے کلب میں شامل کیا جانا چاہیے۔ (اور جب ہمیں اس کلب میں شامل کر لیا جائے گا تو ہم بڑی خوشی سے کلب کا دروازہ اندر سے بند کر لیں گے اور دنیا میں امتیازی سلوک کے خلاف لڑنے کے تمام

اصولوں پر لعنت بھیج دیں گے۔) بھارت کے لیے سپر پاور کے طور پر تسلیم کیے جانے کا مطالبہ اتنا ہی مضحکہ خیز ہے جتنا فٹ بال کے ورلڈ کپ کے فائنل میں کھیلنے کا مطالبہ کرنا، صرف اس بنا پر کہ ہمارے پاس بھی گیند ہے، چاہے ہم نے فائنل کے لیے کوالیفائی نہ کیا ہو، اور ہمارے یہاں فٹ بال زیادہ نہ کھیلی جاتی ہو، اور ہمارے پاس فٹ بال کی ٹیم بھی نہ ہو۔

جب ہم نے اس میدان میں اترنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو بہتر یہ ہوگا کہ اس کھیل کے قواعد سیکھنے سے آغاز کریں۔ اور ان میں پہلا قاعدہ یہ ہے: اپنے سے بڑے کھلاڑیوں کو تسلیم کرو۔ بڑے کھلاڑی کون ہیں؟ وہی جن کے پاس زیادہ دولت ہے، زیادہ غذا ہے، زیادہ بم ہیں۔

دوسرا قاعدہ یہ ہے: ان کے مقابلے میں اپنی حیثیت کا تعین کرو۔ یعنی اپنی پوزیشن اور صلاحیتوں کا ایمانداری سے جائزہ لو۔ شمار کی جاسکنے والی چیزوں کے اعتبار سے اس جائزے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے:

ہم تقریباً ایک ارب انسانوں پر مشتمل قوم ہیں۔ ترقی کے لحاظ سے یو این ڈی پی کے انسانی ترقی کے انڈیکس میں شمار کیے گئے 157 ملکوں میں ہمارا نمبر 138 واں ہے۔ ہماری آبادی میں 40 کروڑ لوگ ناخواندہ ہیں اور انتہائی مفلسی کے عالم میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ 60 کروڑ سے زائد لوگ بنیادی سینی ٹیشن کی سہولتوں سے اور 20 کروڑ سے زیادہ لوگ پینے کے صاف پانی سے محروم ہیں۔

اس طرح سرکاری طور پر بیان کیے گئے تینوں اسباب، ایک ایک کر کے، بالکل بے اصل ٹھہرتے ہیں۔ لیکن اگر ان کو ملا دیا جائے تو ایک مسخ شدہ منطق سامنے آتی ہے۔ اور اس کا تعلق ''اُن'' سے نہیں، ''ہم'' سے ہے۔

ہمارے وزیر اعظم نے امریکی صدر کو جو خط لکھا اس کے کلیدی الفاظ "Suffered" اور "Victim" ہیں۔ یہی اس خط کا لب لباب ہے۔ یہی ہمارا کھانا اور پانی ہے۔ ہم خود کو ستم زدہ محسوس کرنا چاہتے ہیں۔ خود کو بے یار و مددگار محسوس کرنا ہماری ضرورت ہے۔ ہمیں ایک قوم کے طور پر اپنے وجود کا اس قدر خفیف احساس ہے کہ ہمیں مسلسل ایسے دشمنوں کی ضرورت رہتی ہے جن کے مقابلے میں رکھ کر ہم خود کو بیان کر سکیں۔ ہماری مروجہ سیاسی دانشمندی کا مطالبہ ہے کہ ہماری ریاست کو تباہ

ہونے سے بچنے کے لیے ایک قومی مظہر کی ضرورت ہے، اور کرنسی کو چھوڑ کر (اور ہاں، مفلسی، ناخواندگی اور الیکشنوں کو بھی چھوڑ کر) ہمارے پاس کوئی قومی مظہر نہیں ہے۔ یہی اصل قصہ ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر ہم بم تک پہنچے ہیں۔ اپنے وجود کی تلاش میں۔ اگر ہمیں یہاں سے واپسی کا راستہ چاہیے تو چند تکلیف دہ سوالوں کے ایماندارانہ جواب تلاش کرنے ہوں گے۔ میں ایک بار پھر کہتی ہوں: ایسا نہیں کہ یہ سوال اس سے پہلے کبھی نہیں اٹھائے گئے۔ مگر ان سوالوں کے جواب ہم منھ ہی منھ میں بڑبڑاتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ انھیں کسی نے نہیں سنا ہوگا۔

کیا بھارتی پہچان نام کی کسی چیز کا وجود ہے؟

کیا ہمیں واقعی اس کی ضرورت ہے؟

کون مستند بھارتی ہے اور کون نہیں ہے؟

کیا بھارت خود بھارتی ہے؟

کیا اس سے کوئی فرق پڑتا ہے؟

خود کو "بھارتیہ سنسکرتی" پکارنے والی کسی تہذیب کا وجود کبھی رہا ہے یا نہیں؟ آیا بھارت ایک ہم آہنگ تہذیبی وجود کبھی رہا ہے، یا کبھی بن سکے گا؟ ان سوالوں کے جواب کا انحصار اس بات پر ہے کہ آپ برصغیر میں صدیوں سے آباد لوگوں کے مختلف کلچروں کے مابین پائے جانے والے امتیازات پر زور دیتے ہیں یا مماثلتوں پر۔ ایک جدید قومی ریاست کے طور پر بھارت کی جغرافیائی حد بندی پہلی بار 1899 میں برطانوی پارلیمنٹ کے ایک ایکٹ کے ذریعے کی گئی تھی۔ ہمارا ملک، جیسا کہ ہم اسے جانتے ہیں، برطانوی ایمپائر کے اہرن پر، تجارت اور انتظام کے نہایت غیر جذباتی اسباب کے تحت، ڈھالا گیا تھا۔ لیکن پیدا ہوتے ہی اس نے اپنے پیدا کرنے والوں کے خلاف جدوجہد شروع کردی۔ تو پھر، کیا بھارت بھارتی ہے؟ یہ ایک دشوار سوال ہے۔ صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ ہم قدیم لوگ ہیں جو ایک جدید ملک میں رہنا سیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

جو بات ایک حقیقت ہے وہ یہ ہے کہ بھارت ایک مصنوعی ریاست ہے — ایک ایسی ریاست جسے سرکار نے، نہ کہ عوام نے، تخلیق کیا ہے۔ اسے نیچے سے اوپر کی جانب نہیں بلکہ اوپر سے نیچے کی طرف قائم کیا گیا ہے۔ بھارت کے باشندوں کی اکثریت (آج بھی) کسی نقشے پر اس دیس کی

سرحدیں پہچاننے سے قاصر ہے، اور یہ بتانے سے کہ اس دیس کے کس حصے میں کون سی زبان بولی جاتی ہے یا کون سے دیوی دیوتاؤں کی پوجا کی جاتی ہے۔ اس دیس کی آبادی کے بیشتر لوگ اس قدر غریب اور غیر تعلیم یافتہ ہیں کہ اپنے دیس کی وسعت اور پیچیدگی کا سرسری سا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ دیہات میں رہنے والی زراعت پیشہ، مفلس اور ناخواندہ آبادی کا ریاست میں قطعی کوئی حصہ نہیں۔ اور کیوں ہو، جبکہ انھیں اس بات کا علم ہی نہیں کہ ریاست ہوتی کیا شے ہے؟ ان کے نزدیک بھارت محض ایک پُرشور نعرہ ہے جو الیکشن کے دنوں میں سنائی دیتا ہے۔ یا پھر سرکاری ٹی وی پر دکھائے جانے والے لوگوں کی بھیڑ جو رنگ برنگے کپڑے پہنے "میرا بھارت مہان" گایا کرتے ہیں۔

جن لوگوں کو بھارت کے ایک واحد، واضح اور ہم آہنگ پہچان پیدا کرنے سے دلچسپی ہے (بلکہ زیادہ درست یہ کہ جن کا مفاد اس عمل سے وابستہ ہے) وہ سیاستدان ہیں جن پر ہماری قومی سیاسی پارٹیاں مشتمل ہیں۔ اس کی وجہ جاننا نہایت آسان ہے: وہ اس پہچان پر خود قابض ہونا چاہتے ہیں۔ اس پہچان سے اپنی پہچان کو پیوست کرنا چاہتے ہیں۔ اگر کوئی قومی پہچان موجود نہیں ہے تو انھیں اس کو اختراع کر کے لوگوں کے سامنے پیش کرنا ہوگا اور ان سے کہنا ہوگا کہ اسے ووٹ دیں۔ یہ ان سیاستدانوں کا قصور نہیں؛ ان کے پیشے کی مجبوری ہے۔ یہ خرابی ہمارے مرکزی سرکاروں کے نظام میں مضمر ہے۔ یہ ہماری برانڈ کی جمہوریت کا پیدائشی نقص ہے۔ جاہل لوگوں کی تعداد جتنی زیادہ ہوگی، دیس اتنا ہی غریب ہوگا اور سیاستدان اتنے ہی اخلاقی طور پر دیوالیہ ہوں گے، اور قومی پہچان کیا ہونی چاہیے اس کے بارے میں ان کے خیالات اتنے ہی بدہیئت ہوں گے۔ ایسی صورتِ حال میں ناخواندگی محض افسوسناک نہیں بلکہ باقاعدہ خطرناک ہے۔ لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ بھارت کے لیے "قومی پہچان" کی کوئی قابلِ قبول صورت وضع کرنا دانش اور بصیرت رکھنے والے افراد کے لیے بھی نہایت دشوار کام ثابت ہوتا۔ ہر بھارتی شہری اگر چاہے تو خود کو کسی نہ کسی قسم کی اقلیت کا حصہ قرار دے سکتا ہے۔ بھارت کی آبادی کو تقسیم کرنے والی یہ لکیریں افقی، عمودی، تہہ در تہہ، مدوّر، نیچے سے اوپر، اندر سے باہر اور باہر سے اندر جاتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ جب کوئی آگ لگائی جاتی ہے تو وہ ان میں سے کسی بھی لکیر کے ساتھ چلتی ہوئی کہیں بھی پہنچ سکتی ہے اور بے پناہ سیاسی توانائی خارج کر سکتی ہے۔ بالکل ویسی توانائی جیسی ایٹم کو پھاڑنے سے پیدا ہوتی ہے۔

گاندھی نے اسی توانائی کا استعمال کرنا چاہا تھا جب اس نے جادو کا چراغ رگڑ کر رام اور رحیم کو انسانی سیاست میں داخل ہونے اور برطانیہ کے خلاف بھارت کی آزادی کی جنگ میں حصہ لینے کی دعوت دی۔ یہ ایک نازک، شاندار اور پُر تخیل جدوجہد تھی لیکن اس کے مقاصد سادہ اور واضح تھے، ہدف بالکل غیر مبہم اور سامنے تھا اور اس ہدف کے چہرے پر سیاسی گناہ کی علامت بھی صاف دیکھی جا سکتی تھی۔ ان حالات میں اس توانائی کو اپنا مرکز آسانی سے دستیاب ہو گیا۔ مشکل یہ ہے کہ اب حالات بالکل بدل چکے ہیں، مگر جن بوتل سے باہر ہے اور اندر واپس جانے کو تیار نہیں۔ (اسے اندر بھیجا جا سکتا ہے، لیکن کوئی اسے اندر بھیجنے پر آمادہ نہیں، کیونکہ یہ سب کے لیے کارآمد ثابت ہوا ہے۔) درست کہ اس نے ہمیں آزادی دلوائی، لیکن اسی کے باعث تقسیم ملک کے وقت فسادات بھی پیش آئے۔ اور اب، پہلے سے کہیں گھٹیا سیاستدانوں کے ہاتھوں میں، اسی جن نے ہمیں ہندو ایٹم بم کا تحفہ دیا ہے۔

لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ گاندھی اور قومی تحریک کے دوسری رہنماؤں کو وہ دانش حاصل نہ تھی جو ماضی کے تجربات سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ یہ نہیں جان سکتے تھے کہ ان کی اختیار کردہ حکمت عملی کے آخری، طویل میعادی اثرات کیا ہوں گے۔ ان کو اندازہ نہیں ہو سکتا تھا کہ صورت حال یوں پلک جھپکتے میں قابو سے باہر ہو جائے گی۔ وہ نہیں جان سکتے تھے کہ جب وہ یہ مشعل اپنے بعد آنے والوں کے ہاتھ میں دیں گے تو کیا ہو گا، اور نہ یہ کہ ہاتھ کس قدر بددیانت ثابت ہوں گے۔

زوال کا اصل آغاز اندرا گاندھی سے ہوا تھا۔ یہ وہی تھی جس نے بوتل کے اس جن کو مستقل سرکاری مہمان کا درجہ دیا۔ اُسی کے ہاتھوں یہ زہر ہماری سیاسی شریانوں میں داخل ہوا۔ اُسی نے ہماری مخصوص قسم کی سفلہ موقع پرستی کو ایجاد کیا۔ اُسی نے دکھایا کہ کس طرح فرضی دشمن اختراع کیے جاتے ہیں، کیسے اُن خیالی ہستیوں پر آگ برسائی جاتی ہے جنھیں خاص اسی مقصد کے لیے احتیاط سے گھڑا گیا ہو۔ وہی تھی جس نے دریافت کیا کہ لاشوں کو کبھی دفن نہ کرنے کے کیا فوائد ہو سکتے ہیں: وہ جب چاہتی ان متعفن ڈھانچوں کو باہر نکال کر پرانے زخم تازہ کر دیتی تھی۔ اُس نے اور اس کے بیٹوں نے مل کر ملک کو گھٹنوں کے بل جھکا دیا۔ ہماری نئی سرکار کے لیے صرف اتنا کام باقی رہ گیا کہ وہ ہمیں ٹھوکر مار کر اوندھا گرا دے اور ہماری گردن کلھاڑے کی زد پر رکھ دے۔

بعض اعتبار سے بھارتیہ جنتا پارٹی ایک ایسا عفریت ہے جسے اندرا گاندھی اور کانگریس نے تخلیق کیا۔ یا اگر آپ اتنے سفاک ہونا نہیں چاہتے تو یہ کہہ لیجیے کہ یہ وہ عفریت ہے جس نے ان سیاسی خلاؤں اور فرقہ وارانہ شکوک میں خوراک اور پرورش پائی جنھیں کانگریس نے پیدا کیا اور بڑھایا تھا۔ اس نے انتظامی سیاست کو ایک نئے رنگ میں رنگ ڈالا۔ جب اندرا گاندھی سیاستدانوں اور ان کی پارٹیوں کے ساتھ درپردہ کھیلوں میں مصروف تھی، تب اس نے عام لوگوں سے خطاب کرنے کے لیے کانونٹ سکولوں کے سے انداز کی خطابت تیار کر رکھی تھی جس میں پٹے ہوئے بلند بانگ الفاظ کی ریل پیل تھی۔ اس کے برخلاف بی جے پی نے اپنی "گ سیدھے سڑکوں پر اور لوگوں کے گھروں اور دلوں میں بھڑکانے کا انتخاب کیا۔ وہ دن دہاڑے وہ سب کچھ کرنے کو تیار ہے جو کانگریس صرف رات میں کرنا پسند کرتی ہے۔ جو باتیں پہلے ناقابلِ قبول سمجھی جاتی تھیں (مگر اس کے باوجود کی جاتی تھیں) ان کو جائز بنانے کو تیار ہے۔

یہاں شاید منافقت کے حق میں ایک کمزور سا مقدمہ تیار کیا جا سکتا ہے۔ کیا کانگریس کی منافقت سے، اس حقیقت سے کہ وہ لوگ اپنے شرمناک افعال کھلم کھلا نہیں بلکہ چوری چھپے انجام دیتے ہیں، یہ معنی نکالے جا سکتے ہیں کہ کہیں احساسِ جرم کی کوئی ہلکی سی رمق موجود ہے؟ گزری ہوئی شائستگی کی خفیف سی جھلک؟

درحقیقت ایسا نہیں ہے۔

نہیں، ایسا ہرگز نہیں ہے۔

یہ میں کیا کر رہی ہوں؟ امید کے ذرا ذرا سے تنکوں کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہوں؟

یہ سب کچھ جس طرح پیش آیا ہے — بابری مسجد کے ڈھائے جانے کے سلسلے میں بھی اور ایٹم بم بنانے کے معاملے میں بھی — اس کی اصل یہ ہے کہ کانگریس نے بیج بوئے اور فصل تیار کی، پھر بی جے پی منظر پر نمودار ہوئی اور اس نے یہ مہیب، تیار فصل کاٹ لی۔ یہ دونوں — کانگریس اور بی جے پی — رقص کے ساتھی ہیں، ایک دوسرے کی بانہوں میں لپٹے ہوئے۔ ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا، خواہ وہ ایک دوسرے سے اختلافات کا کتنا ہی اظہار کیوں نہ کریں۔ ان دونوں نے مل کر ہمیں یہاں، اس دہشت ناک مقام پر پہنچا دیا ہے۔

وہ قہقہے لگاتے، ہنگامہ کرتے نوجوان جنھوں نے بابری مسجد کو مسمار کیا تھا وہی ہیں جن کی تصویریں ایٹمی آزمائشوں کے اگلے دن اخباروں میں شائع ہوئیں۔ یہ وہی تھے جو سڑکوں پر بھارت کے ایٹم بم کی خوشی منا رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ کوک اور پیپسی کے کریٹ خالی کرتے ہوئے ''مغربی کلچر'' کی مذمت بھی کرتے جا رہے تھے۔ میں ان کی منطق سے چکرا کر رہ جاتی ہوں: کوک تو مغربی کلچر ہے، اور ایٹم بم غالباً ایک پراچین بھارتیہ پرمپرا ہے؟

ہاں، میں نے یہ بات سن رکھی ہے — کہ بم کا ذکر ویدوں میں موجود ہے۔ ممکن ہے، ہو، لیکن اگر آپ غور سے دیکھیں تو آپ کو شاید وہیں کہیں کوک کا ذکر بھی دکھائی دے جائے گا۔ تمام مذہبی متنوں کی یہی تو بڑی خوبی ہے۔ آپ ان میں جو چاہیں تلاش کر سکتے ہیں، بشرطیکہ آپ کو معلوم ہو کہ آپ کو کس شے کی تلاش ہے۔

لیکن ویدوں کے بہت بعد 1990 کی دہائی میں واپس لوٹتے ہوئے: سفید فام انداز فکر کے قلب میں داخل ہو کر ہم نے مغربی سائنس کی بدترین ایجاد کو سینے سے لگا لیا۔ لیکن ان کی موسیقی، ان کی غذا، ان کا لباس، ان کا سنیما اور ان کا ادب ہمارے احتجاج کا ہدف بنا ہوا ہے۔ اسے منافقت نہیں کہا جاتا۔ یہ مزاح ہے۔

یہ ایک ایسا مذاق ہے جو کسی کھوپڑی کے ہونٹوں پر بھی مسکراہٹ لے آئے۔

ہم دوبارہ اسی دُخانی جہاز پر سوار ہیں۔ نازی ایس ایس کی مستند آریائی اور مستند بھارتی پہچان کے جہاز پر۔

اگر استاد دوست (یعنی قوم دشمن) تحریک کا چلایا جانا لازمی ہے تو سرکار کو تاریخ کا درست علم اور حقائق کی صحیح پہچان تو ہونی چاہیے۔ اگر یہ کام کرنا ہی ہے تو پھر کیوں نہ ٹھیک سے کیا جائے۔

سب سے پہلی بات یہ کہ اس خطے کے اصل رہنے والے ہندو نہیں تھے۔ ہندو مت قدیم ضرور ہے، لیکن انسان اس زمین پر ہندو مت کے پیدا ہونے سے پہلے بھی موجود تھا۔ بھارت کے آدی واسی قبائلیوں کا دعویٰ اس سرزمین پر بسنے والے تمام دوسرے گروہوں سے زیادہ مضبوط ہے۔ اور ان اصل باشندوں کے ساتھ ریاست اور اس کے کارندوں نے کیا سلوک کیا؟ انھیں کچلا گیا، دھوکا دیا گیا، ان سے ان کی زمین چھین لی گئی اور انھیں فالتو چیزوں کی طرح سامنے سے ہٹا کر کونے میں پھینک دیا

گیا۔ مستند بھارت کے سلسلے میں چلائی جانے والی کسی تحریک کا آغاز اس نقطے سے کیا جانا چاہیے کہ ان لوگوں کو وہ عزت واپس دی جائے جو کبھی انھیں حاصل تھی۔ غالباً ہماری سرکار یہ واضح اعلان کر سکتی ہے کہ نرمداندی پر سردار سرودر ڈیم جیسے ڈیم اور نہیں بنائے جائیں گے اور انسانی آبادیوں کو ان کے رہنے کی جگہ سے نہیں ہٹایا جائے گا۔

مگر ظاہر ہے، یہ بات ناقابلِ تصور ہوگی۔ کیوں؟ کیونکہ یہ عملی طور پر ناممکن ہے۔ کیونکہ آدی واسیوں کی دراصل کوئی اہمیت نہیں۔ ان کی تاریخ، ان کے رسم و رواج، ان کے دیوی دیوتا سب فالتو چیزیں ہیں۔ ان کو چاہیے کہ اپنی ان چیزوں کو قوم کی وسیع تر بھلائی کے لیے قربان کرنا سیکھیں (اسی قوم کی بھلائی کے لیے جس نے ان سے ان کا سب کچھ چھین لیا ہے)۔

چلیے، ان کا قصہ تو یوں پاک ہوا۔

رہیں باقی چیزیں، تو میں ایک جامع عملی فہرست تیار کر سکتی ہوں کہ کن کن چیزوں پر پابندی لگائی جانی چاہیے اور کن کن عمارتوں کو ڈھایا جانا چاہیے۔ مکمل فہرست تیار کرنے کے لیے تھوڑی سی تحقیق درکار ہوگی، لیکن چند تجاویز تو میں بغیر تیاری کے بھی پیش کر سکتی ہوں۔

وہ لوگ اپنے کام کا آغاز ہماری غذا میں شامل بیرونی اشیا کو خارج کر کے کر سکتے ہیں: مرچ (میکسیکو)، ٹماٹر (پیرو)، آلو (بولیویا)، کافی (مراکش)، چائے، سفید شکر اور دارچینی (چین)... اس کے بعد وہ غذا تیار کرنے کی ترکیبوں کی جانب قدم بڑھا سکتے ہیں۔ مثلاً دودھ اور شکر والی چائے (برطانیہ)۔

تمباکو نوشی کا تو ظاہر ہے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تمباکو شمالی امریکہ سے آیا تھا۔

کرکٹ، انگریزی زبان اور جمہوریت پر پابندی لگا دینی چاہیے۔ کرکٹ کی جگہ کبڈی یا کھوکھو دی جا سکتی ہے۔ میں کوئی جھگڑا کھڑا نہیں کرنا چاہتی اس لیے انگریزی کا متبادل تجویز کرتے ہوئے مجھے ہچکچاہٹ ہو رہی ہے۔ (اطالوی؟... آخر یہ زبان ہم تک زیادہ محبت بھرے راستے سے پہنچی ہے۔ شادی سے نہ کہ امپریلزم سے۔) جہاں تک جمہوریت کے نمودار ہوتے ہوئے، اور بظاہر سب کے لیے قابلِ قبول، متبادل کا سوال ہے، اس کا ذکر پہلے (اسی مضمون میں) آ چکا ہے۔

وہ تمام اسپتال جن میں مغربی طب کے طریقے استعمال یا تجویز کیے جاتے ہیں، بند کر دینے

چاہییں۔ تمام قومی اخبارات کی اشاعت روک دینی چاہیے۔ ریلوے لائنوں کو اکھاڑ پھینکنا چاہیے۔ ایر پورٹ بند کر دینے چاہییں۔ اور ہمارے تازہ ترین کھلونے —— موبائل فون —— کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا ہم اس کے بغیر رہ سکتے ہیں؟ یا مجھے اس کے سلسلے میں استثنیٰ کی تجویز پیش کرنی چاہیے؟ اسے غالباً ''یونیورسل'' کے خانے میں ڈالا جا سکتا ہے۔ (اس خانے میں صرف بنیادی ضرورت کی اشیا رکھی جائیں گی؛ موسیقی اور ادب کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوگی۔) یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ اپنے بچوں کو پڑھنے کے لیے امریکی یونیورسٹیوں میں بھیجنا یا اپنا پروسٹیٹ نکلوانے کے لیے خود امریکہ جانا قابلِ سزا جرم ہوگا۔

عمارتوں کو ڈھانے کی مہم راشٹرپتی بھون سے شروع کی جائے اور رفتہ رفتہ اسے شہروں سے دیہاتوں تک پھیلایا جائے اور راستے میں آنے والی ان تمام یادگاروں (مسجدوں، گرجا گھروں اور مندروں) کو تباہ کر دیا جائے جو اس زمین پر تعمیر کی گئیں جو کبھی قبائلی یا جنگلی زمین تھی۔

یہ ایک طویل، بہت طویل فہرست ہوگی۔ اسے تیار کرنا ہی برسوں کا کام ہے۔ اور اس کی تیاری میں مجھے کمپیوٹر کی مدد بھی حاصل نہیں ہوگی، کیونکہ ظاہر ہے یہ تو کوئی مستند بھارتی طریقہ نہیں ہو گا۔

میں مذاق کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتی، صرف اس بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتی ہوں کہ یہ راستہ جہنم میں جانے کے شارٹ کٹ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ ''مستند بھارت'' یا ''اصل بھارتی'' نام کی کسی شے کا وجود نہیں ہے۔ ایسی کوئی خدائی کمیٹی نہیں ہے جو بھارت یا بھارتیہ تا کے کسی ایک روپ کو منظور شدہ روپ قرار دے کر یہ طے کر دے کہ اسے یہی ہونا چاہیے۔ کوئی مذہب، کوئی زبان، کوئی ذات، کوئی علاقہ، کوئی شخص، کوئی کہانی، کوئی کتاب ایسی نہیں جو بھارت کی واحد نمائندہ ہونے کا دعویٰ کر سکے۔ ہاں، بھارت کے بارے میں مختلف وژن ہیں، اور ہو سکتے ہیں، اور بھارت کو دیکھنے کے مختلف طریقے ہیں —— ایماندارانہ، بددیانت، حیران کن، لغو، جدید، روایتی، مردانہ، زنانہ۔ ان پر بحث کی جا سکتی ہے، ان پر تنقید ہو سکتی ہے، ان کی تعریف ہو سکتی ہے، ان پر طنز کیا جا سکتا ہے، لیکن ان میں سے کسی پر پابندی نہیں لگائی جا سکتی، نہ ان میں سے کسی کو تباہ کیا جا سکتا ہے۔ ان کو دھمکا کر خاموش بھی نہیں کرایا جا سکتا۔

ماضی کے خلاف زہر اگلنے سے ہمیں کچھ حاصل نہیں ہونے والا۔ ماضی ان واقعات پر مشتمل ہے جو پیش آ چکے ہیں۔ یہ وہ باب ہے جو بند ہو چکا ہے۔ جو راستہ مستقبل کی طرف جاتا ہے اس کی سمت بدلنے کے لیے ہم صرف یہ کر سکتے ہیں کہ ماضی کی جن چیزوں سے ہمیں محبت ہے ان کی حوصلہ افزائی کریں، نہ کہ جن چیزوں سے ہمیں نفرت ہے ان کو تباہ کرنے کی کوشش کریں۔ ہماری اس سفاک، مجروح دنیا میں بھی حسن موجود ہے — پوشیدہ، شدید اور فراواں۔ وہ حسن جو بلاشرکت غیرے ہمارا اپنا ہے اور وہ حسن بھی جسے ہم نے وقار کے ساتھ دوسروں سے حاصل کیا ہے، اسے بڑھایا ہے، نئی اختراعات کر کے اسے سنوارا ہے، اسے اپنایا ہے۔ ہمیں حسن کو تلاش کرنا ہوگا، اس کو پروان چڑھانا ہوگا، اس سے محبت کرنی ہوگی۔ بم بنا کر اس کو صرف تباہ کیا جا سکتا ہے۔ اور اس سے بھی کچھ فرق نہیں پڑتا کہ ہم اس بم کو استعمال کرتے ہیں یا نہیں۔ بم ہمیں دونوں صورتوں میں تباہ کر ڈالے گا۔

بھارت کا ایٹم بم اس حکمران طبقے کی جانب سے حتمی غداری کا فعل ہے جس نے اپنے عوام کو دھوکا دیا ہے۔

ہم اپنے سائنسدانوں کو تعریف کے کتنے ہی ہاروں سے لاد دیں، ان کے سینوں پر کتنے ہی تمغے آویزاں کر دیں، حقیقت یہی ہے کہ بم بنانا بہت آسان کام ہے! چالیس کروڑ عوام کو تعلیم دینا اس سے کہیں زیادہ دشوار ہے۔

رائے عامہ کے جائزے ہم سے یہ ماننے کی توقع کرتے ہیں کہ اس مسئلے پر قومی اتفاقِ رائے موجود ہے۔ اب تو یہ سرکاری موقف ہو گیا ہے — ہر شخص بم سے محبت کرتا ہے (چنانچہ بم ضرور اچھی چیز ہے)۔

جو شخص اپنا نام تک نہیں لکھ سکتا، کیا اس کے لیے ایٹمی اسلحے کے بارے میں نہایت بنیادی، سادہ ترین حقائق تک کو سمجھ پانا ممکن ہے؟ کیا کسی نے اس شخص کو اطلاع دی ہے کہ ایٹمی جنگ کا جنگ کے اُس تصور سے ذرا سا بھی تعلق نہیں جو قدیم زمانے سے اس تک پہنچا ہے؟ کہ اس جنگ کا شجاعت اور عزت کے تصورات سے کوئی تعلق نہیں؟ کیا کسی نے اس کو یہ سمجھانے کی زحمت اٹھائی ہے کہ تھرمل بلاسٹ، ریڈیو ایکٹو اثرات اور ایٹمی موسم سرما کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ کیا اس شخص کی زبان میں ایسے

لفظ ہیں جن کی مدد سے افزودہ یورینیم، فِسل میٹریل اور کریٹیکل ماس کے تصورات کو بیان کیا جا سکے؟ یا اس کی زبان فرسودہ ہو گئی ہے اور اس کی کوئی اہمیت نہیں رہی؟ کیا وہ کسی ٹائم کیپسول میں بند، دنیا کو اپنے آس پاس سے گزرتا دیکھنے اور کچھ نہ سمجھ پانے، کسی شے سے رابطہ قائم نہ کر سکنے پر مجبور ہو چکا ہے، صرف اس لیے کہ اس کی زبان اُن بھیانک چیزوں کو نام دینے سے قاصر ہے جنھیں بنی نوع انسان نے ایجاد کیا ہے؟ کیا اس شخص کے وجود کی کوئی اہمیت نہیں؟ کیا ہم اس کے ساتھ وہ سلوک کریں گے جو ذہنی طور پر پسماندہ افراد کے ساتھ کرتے ہیں؟ کیا اس کے سوالوں کا جوب ہم آیوڈین کی گولیاں کھانے کے مشوروں اور ان قصے کہانیوں سے دیں گے کہ کس طرح بھگوان کرشن نے پہاڑی کو انگلی کی نوک پر اٹھا لیا تھا اور کس طرح ہنومان کے ہاتھوں لنکا کی تباہی رام اور سیتا کی نیک نامی قائم رکھنے کے لیے ناگزیر تھی؟ کیا ہم اس کی اپنی ان خوبصورت اور پرتخیل کہانیوں کو اسی کے خلاف ہتھیاروں کے طور پر استعمال کریں گے؟ کیا ہم اسے صرف الیکشن کے وقت اس کے کیپسول سے باہر نکالیں گے، اور جب وہ ووٹ ڈال چکا ہو گا، اس سے ہاتھ ملا کر عوامی دانش کے بارے میں تھوڑی بہت بکواس کر کے اسے دوبارہ کیپسول میں ٹھونس دیں گے؟

ظاہر ہے، میں کسی ایک فرد کی بات نہیں کر رہی ہوں۔ میں ان کروڑوں لوگوں کی بات کر رہی ہوں جو اس ملک میں رہتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ یہ دھرتی ان کی بھی ہے۔ ان کو بھی مسئلے کے تمام پہلوؤں سے واقف ہو کر اپنی قسمت کے فیصلے میں شریک ہونے کا پورا حق ہے، اور جہاں تک مجھے معلوم ہے کسی نے ان کو کسی بات کی اطلاع نہیں دی ہے۔ المیہ یہ ہے کہ اگر کوئی چاہے بھی تو ایسا نہیں کر سکتا۔ درحقیقت ایسی کوئی زبان ہی وجود نہیں رکھتی جس میں ان کو یہ ہولناک باتیں سمجھائی جا سکیں۔ بھارت کی اصل دہشت ناک حقیقت یہی ہے۔ طاقت پر قابض افراد اور طاقت سے محروم لوگ اپنے اپنے مداروں میں ہیں اور ایک دوسرے سے مسلسل دور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کے راستے ایک دوسرے کو قطع نہیں کرتے، ان کی کوئی چیز مشترک نہیں ہے —— نہ زبان، نہ ملک۔

وہ لوگ کون ہیں جنھوں نے رائے عامہ کے یہ جائزے مرتب کیے ہیں؟ وزیر اعظم کون ہوتا ہے یہ فیصلہ کرنے والا کہ کس کی انگلی ایک بٹن دبا کر ہماری ہر محبوب شے کو —— ہماری زمین، ہمارے آسمان، ہمارے پہاڑوں، ہمارے میدانوں، ہماری ندیوں، ہمارے شہروں اور گاؤوں کو —— لمحہ بھر

میں نیست ونابود کردے؟ کون ہوتا ہے وہ ہمیں یہ تسلی دینے والا کہ کوئی حادثہ رونما نہیں ہوگا؟ اسے کیا پتا؟ ہم اس پر کیوں اعتبار کریں؟ اس نے کون سا ایسا عمل کیا ہے کہ وہ ہمارے اعتبار کا اہل بن سکے؟ کیا ان میں سے کسی ایک شخص نے بھی کبھی ایسا کوئی کام کیا ہے کہ ہم ان پر اعتبار کرسکیں؟

ایٹم بم انسان کے ہاتھوں وجود میں آنے والی سب سے زیادہ جمہوریت دشمن، قوم دشمن، انسان دشمن، اور شیطانی چیز ہے۔

اگر آپ مذہب پر یقین رکھتے ہیں تو یاد رکھیے کہ ایٹم بم انسان کی طرف سے خدا کو دیا جانے والا چیلنج ہے۔

اس چیلنج کے الفاظ بالکل سادہ ہیں: تو نے جو کچھ بنایا ہے اسے ہم تباہ کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔

اگر آپ مذہبی نہیں ہیں تو اس کو یوں دیکھ سکتے ہیں:

ہماری دنیا چار ارب ساٹھ کروڑ سال پرانی ہے۔

اور یہ محض ایک سہ پہر میں تباہ کی جاسکتی ہے۔

❁❁

عظیم تر اجتماعی مفاد

''اگر آپ کو مشکل اٹھانی ہے تو ملک کے مفاد میں اٹھانی چاہیے۔''

——جواہر لال نہرو، گاؤں والوں سے مخاطب ہو کر
جنھیں ہیرا کنڈ ڈیم کے لیے بے دخل کیا جانے والا تھا، 1948۔

❀

میں ایک پہاڑی پر کھڑی تھی اور زور زور سے ہنس رہی تھی۔

میں نے جلسندھی کے مقام سے کشتی میں نرمدا ندی پار کی تھی اور اس طرف کنارے کی چڑھائی چڑھ کر یہاں پہنچی تھی، اور یہاں سے مجھے ندی کنارے کی کم قد، بے گیاہ پہاڑیوں پر یہاں وہاں پھیلی سکا، سورونگ، نیم گاون اور ڈوم کیڑی کی آدی واسی بستیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ مجھے ان کی کھیتیاں اور ان کے پیچھے کے جنگل دکھائی دے رہے تھے۔ مجھے اس سارے پھیلاؤ میں چھوٹے بچے، خود سے بھی چھوٹی بکریوں کے ساتھ، ڈولتے پھرتے یوں نظر آ رہے تھے جیسے مونگ پھلی کے دانے اِدھر اُدھر لڑھک رہے ہوں۔ میں جانتی تھی کہ میری نظروں کے سامنے وہ تہذیب ہے جو ہندومت سے کہیں زیادہ قدیم ہے، اور جو اِس آنے والے مون سون میں سردار سروور ڈیم کے ذخیرۂ آب میں ڈوب

جانے والی ہے؛ یہ انجام اس کے لیے مقدر کر دیا گیا ہے، اور ملک کی اعلیٰ ترین عدالت نے اس پر اپنی مقدس مہرِ تصدیق بھی ثبت کر دی ہے۔

میں ہنس کیوں رہی تھی؟

کیونکہ مجھے اچانک اُس دردمندانہ تشویش کا خیال آ گیا تھا جس کے زیرِ اثر دہلی میں سپریم کورٹ کے ججوں نے (سردار سرووَر ڈیم کی تعمیر پر عائد حکمِ امتناعی کو منسوخ کرنے سے ذرا پہلے) یہ استفسار کیا تھا کہ ڈیم کی تعمیر کے لیے بے گھر ہونے والے آدی واسیوں کو جن کالونیوں میں بسایا جائے گا وہاں ان کے بچوں کے کھیلنے کے لیے پارک ہیں یا نہیں۔ سرکار کی پیروی کرنے والے وکیلوں نے نہایت مستعدی سے انھیں یقین دلایا تھا کہ نہ صرف وہاں بچوں کے کھیلنے کے لیے پارک موجود ہوں گے بلکہ ان میں سے ہر پارک میں سی سا اور پھسلنیاں اور جھولے بھی لگے ہوں گے۔ میں نے یہاں کھڑے ہو کر اوپر آسمان کو اور پھر نیچے سے گزرتی ہوئی پُرشور ندی کو دیکھا، اور پھر ایک مختصر، نہایت مختصر لمحے کے لیے اس پورے قصے کی لغویت نے میرے غصے کو پیچھے دھکیل دیا اور میں ہنس پڑی۔ اس ہنسی سے میرا مطلب کسی قسم کی گستاخی نہیں تھا۔

یہ بات مجھے شروع ہی میں واضح کر دینی چاہیے کہ میں شہری زندگی کی مذمت کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ میں ایک گاؤں میں بھی اپنے حصے کا وقت گزار چکی ہوں اور گاؤں کی زندگی کی تنہائی، نابرابری اور ممکنہ وحشیانہ پن کا براہِ راست تجربہ کر چکی ہوں۔ میں ترقی کے مخالف نشہ بازوں میں سے بھی نہیں ہوں اور نہ میں نے روایات اور رسم و رواج کو ابد تک ان کی اصل شکل میں برقرار رکھنے کا علم اٹھا رکھا ہے۔ میں اگر کچھ ہوں تو صرف متجسس ہوں۔ میرا تجسس ہی مجھے نرمدا کی وادی میں لے گیا۔ میری جبلت نے مجھے احساس دلایا کہ یہاں ایک بڑا واقعہ ہو رہا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں جنگ کی صف بندی بالکل واضح ہے اور جنگ پر تلی ہوئی مخالف فوجیں ایک دوسرے کے عین سامنے کھڑی ہیں۔ جہاں میں نے پایا کہ امید، غصے، اطلاعات، غلط اطلاعات، سیاسی ڈھونگ، انجینیئرنگ کی اونچی امنگیں، بے خلوص سوشلزم، انتہاپسندانہ سیاسی عمل، افسرشاہی کی مکاری، غلط علم پر مبنی جذباتیت، اور، بلاشبہ، بین الاقوامی امداد کی ہمیشہ موجود اور ہمیشہ مشکوک سیاست ـــ ان سب کے باہم گتھے ہوئے دلدلی آمیزے میں سے بمشکل گزرنا یقیناً ممکن ہے۔

میری جبلت نے مجھے مجبور کیا کہ جوکس اور نابوکوف کو ایک طرف رکھ دوں، ڈان ڈی لیلو کی موٹی کتاب کا پڑھنا ملتوی کروں اور اس کے بجائے نکاس اور آبپاشی کے بارے میں رپورٹیں پڑھوں، ڈیموں کے بارے میں پیشہ ورانہ جریدوں اور درسی کتابوں کا مطالعہ کروں اور دستاویزی فلمیں دیکھوں جن میں یہ بتایا جاتا ہے کہ ڈیم کیوں بنائے جاتے ہیں اور وہ کیا کام کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں میرے اولین متذبذب سوالوں نے یہ انکشاف کر دیا کہ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ نرمدا ندی کی وادی میں دراصل کیا ہو رہا ہے۔ جو لوگ جانتے ہیں وہ بہت کچھ جانتے ہیں — بیشتر لوگ کچھ بھی نہیں جانتے — اور اس کے باوجود ہر شخص اس بارے میں اپنی جذبے سے بھرپور ذاتی رائے رکھتا ہے۔ غیر جانبدار کوئی نہیں ہے۔ مجھے بہت جلد احساس ہو گیا کہ میں جس زمین پر چل رہی ہوں وہ بارودی سرنگوں سے اٹی ہوئی ہے۔

بھارت میں پچھلے دس برسوں کے دوران سردار سرووَر ڈیم کے خلاف لڑائی نے محض ایک ندی کے سلسلے میں کی جانے والی جدوجہد سے آگے جا کر اس سے کہیں زیادہ بڑی چیزوں کی نمائندگی شروع کر دی ہے۔ یہ اس تحریک کی کمزوری بھی ہے اور اس کی قوت بھی۔ چند برس پہلے یہ ایک ایسی بحث بن گئی جس نے عوامی تخیل کو پوری طرح اپنے بس میں کر لیا۔ اور یہی وجہ تھی کہ اس پر لگا ہوا داؤ بہت بڑھ گیا اور اس لڑائی کی شکل ہی بدل گئی۔ ایک ندی کی وادی کے سوال پر لڑی جانے والی لڑائی سے آگے جا کر اس نے ایک پورے سیاسی نظام کے بارے میں شبہات ابھارنا شروع کر دیے۔ اب جو شے بحث کا مرکز ہے وہ ہماری جمہوریت کی اصل نوعیت ہے۔ یہ زمین کس کی ہے؟ یہاں کی ندیاں کس کی ملکیت ہیں؟ اور جنگل؟ اور مچھلیاں؟ یہ بہت بڑے سوالات ہیں۔ ریاست بھی بہت بڑی سنجیدگی کے ساتھ ان کا سامنا کر رہی ہے۔ اس ریاست کا حکم ماننے والا ہر ادارہ — خواہ وہ فوج ہو یا پولیس یا افسر شاہی یا عدالتیں — ان سوالوں کے جواب یک آواز ہو کر دے رہا ہے۔ اور ان سب نے فقط جواب ہی نہیں دیا بلکہ قطعی غیر مبہم اور تلخ اور وحشیانہ انداز میں جواب دیا ہے۔

خود وادی کے رہنے والوں کے لیے اس بات کا کہ ان کی لڑائی پر لگا ہوا داؤ اتنا بڑھ گیا ہے، مطلب یہ نکلا ہے کہ ان کا سب سے پُراثر ہتھیار بڑے بڑے سوالوں پر ہونے والی بہت بڑی بحث نے کند کر ڈالا ہے — یعنی اس مخصوص وادی کے بعض مخصوص مسائل کے بارے میں مخصوص حقائق

نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ بحث کے اصل نکتے کو غبارے کی طرح اس حد تک پھلا دیا گیا کہ وہ پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور وہ ٹکڑے ہوا میں منتشر ہو گئے۔ کبھی کبھار اس جگ سا پزل کا ایک اکیلا ٹکڑا بہتا بہتا سامنے آ جاتا ہے — بے گھر ہونے والے لوگوں کے ساتھ سرکار کے بے دردی کے سلوک کا جذباتی بیان، اس بات پر طیش بھرا ردعمل کہ کس طرح نرمدا بچاؤ آندولن (NBA) نے، "یعنی مٹھی بھر کارکنوں نے"، پوری قوم کو یرغمال بنا رکھا ہے — سپریم کورٹ میں این بی اے کی دائر کردہ رٹ پٹیشن کی کارروائی کے بارے میں کسی قانونی خبر نگار کی رپورٹ۔

اس موضوع پر خاصا کچھ لکھا گیا ہے، لیکن اس کا بیشتر حصہ صرف "خاص دلچسپی" رکھنے والے قارئین کے پڑھنے کے لیے ہے۔ اخباری رپورٹیں آبپاشی کے اس منصوبے کے کسی نہایت جزیاتی معاملے کے بارے میں ہوتی ہیں۔ سرکاری دستاویزات پر "خفیہ" کا لیبل لگا ہوتا ہے۔ میرے خیال میں یہ کہنا درست ہوگا کہ اس معاملے میں عوامی تصورات خاصے خام ہیں، اور عمومی طور پر انھیں دو درجوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

ایک گروہ اسے 'ترقی' کی جدید، مبنی بر عقل، ترقی پسندانہ قوتوں اور ایک نوروایتی (Neo-Luddite) اضطرار — یعنی عقل مخالف، جذباتی، ترقی دشمن مزاحمت — کے درمیان جنگ کے طور پر دیکھتا ہے جس کے لیے قبل از صنعتی دور کی ایک سادہ لوح خواب نما کی ایندھن کا کام کر رہی ہے۔ دوسرا گروہ اس کا تصور نہرو اور گاندھی کے مقابلے کے طور پر کرتا ہے۔ اس طریق کار سے یہ شے اپنی فریب دہی، دروغ گوئی، جھوٹے وعدوں اور روز افزوں کامیابی سے کیے جانے والے پروپیگنڈے کی افسوسناک سطح سے (جو اس کی اصل سطح ہے) قدرے اوپر اٹھ جاتی ہے اور اسے ایک قسم کا جھوٹا جواز حاصل ہو جاتا ہے۔ اس طرح یوں معلوم ہونے لگتا ہے گویا دونوں نقطۂ نظر رکھنے والے فریق دراصل قوم کے وسیع تر مفاد ہی کو پیش نظر رکھتے ہیں؛ اور ان کا اختلاف محض اس مفاد کو حاصل کرنے کے ذریعے کے سلسلے میں ہے۔

یہ دونوں تعبیریں اس پورے تنازعے کو ایک تھکا دینے والا معاملہ بنا دیتی ہیں۔ دونوں ایسے جذبات کو متحرک کرتی ہیں جو ایک مخصوص کہانی کے مخصوص حقائق کو دھندلا دیتے ہیں۔ دونوں سے اس

بات کا اشارہ ملتا ہے کہ ہمیں نئے ہیروؤں ـــ نئی قسم کے ہیروؤں ـــ کی کس قدر ضرورت ہے، اور یہ کہ ہم نے اپنے پرانے ہیروؤں کو (اپنی کرکٹ ٹیم کے بالروں کی طرح) کثرتِ استعمال سے ناکارہ بنا دیا ہے۔

نہرو بمقابلہ گاندھی والی تشریح اس نہایت معاصر معاملے کو وقت میں پیچھے کی سمت لے جا کر گویا ایک پرانی بوتل میں قید کر دیتی ہے۔ نہرو اور گاندھی کشادہ دل افراد تھے۔ ترقی کی بابت ان دونوں کے نقطۂ نظر کی بنیاد کسی نہ کسی اخلاقی تصور پر تھی۔ نہرو کے نقطۂ نظر کی بنیاد سوویت انداز کی مرکزیت پسند ریاست والی پدرانہ، تحفظ دینے والی اخلاقیات پر تھی۔ گاندھی کا نقطۂ نظر رومان انگیز دیہی جمہوریتوں کی مادرانہ، پالنے پوسنے والی اخلاقیات پر مبنی تھا۔ دونوں نقطۂ نظر عملی طور پر نہایت کامیاب ثابت ہو سکتے تھے۔ بشرطیکہ ہم بہتر انسان ہوتے؛ بشرطیکہ ہم سب کھادی پہنتے اور اپنی اسفل امنگوں ـــ جنس، شاپنگ، چرخے کے سبق سے بھاگنے اور اپنے سے کمتر قسمت رکھنے والوں کے ساتھ نامہربانی کا سلوک کرنے کی امنگوں ـــ کو قابو میں رکھ پاتے۔ پچاس برس گزرنے کے بعد، اب یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ہم اس معیار پر پورے نہیں اترے۔ ہم اس معیار کے آس پاس بھی نہیں پہنچ سکے۔ ہمیں خود اپنی بنیادی فطرت سے لاحق خطرات کے خلاف ایک نئی وضع کی انشورنس پالیسی حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ ممکن ہے کہ ہم اس صدی کے لیے اپنا ہیروؤں کا کوٹا پورا کر چکے ہوں، لیکن جس وقت ہم نئے نویلے چمکتے ہوئے ہیروؤں کی آمد کا انتظار کر رہے ہوں، اس دوران بھی ہمیں اپنے نقصان کو کم سے کم رکھنے کی کوشش تو کرنی ہی ہوگی۔ ہمیں اپنے چھوٹے ہیروؤں کا ساتھ دینا ہوگا۔ (اور اس قسم کے ہیرو تعداد میں بہت ہیں، بہت سارے!) ہمیں مخصوص لڑائیاں مخصوص طریقے استعمال کرتے ہوئے لڑنی ہوں گی۔ کون جانے، اکیسویں صدی اپنے ساتھ ہمارے لیے یہی تحفہ لے کر آ رہی ہو ـــ تمام بڑی بڑی چیزوں کا انہدام: بڑے بڑے ڈیم، بڑے نظریے، بڑے تضادات، بڑے ملک، بڑی جنگیں، بڑے ہیرو، بڑی غلطیاں۔ شاید یہ چھوٹی چیزوں کی صدی ہوگی۔ شاید ٹھیک اس لمحے، آسمانوں میں ایک چھوٹا خدا خود کو ہمارے لیے تیار کر رہا ہو۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ کیا ایسا ہونا ممکن ہے؟ مجھے یہ خیال بہت لذت انگیز لگتا ہے۔

وادی نے مجھے اپنی طرف کھینچا کیونکہ میرا اندازہ تھا کہ نرمداندی کے لیے لڑی جانے والی لڑائی اب ایک نئے، غمناک مرحلے میں داخل ہو گئی ہے۔ میں اس لیے وہاں گئی کہ ادیب کہانیوں کی طرف یوں کھنچے چلے جاتے ہیں جیسے گدھ لاشوں کی طرف۔ میرا عمل ہمدردی کے زیر اثر نہیں تھا۔ میری غرض ایک طرح کا لالچ تھی۔ اور میرا خیال درست نکلا۔ مجھے وہاں ایک کہانی ملی۔

اور کیا کہانی ہے یہ!

''لوگ کہتے ہیں کہ سردار سرووَر ڈیم کا منصوبہ ایک مہنگا منصوبہ ہے۔ لیکن اس کے نتیجے میں دسیوں لاکھ لوگوں کو پینے کا پانی ملے گا۔ یہ ہماری شہ رگ ہے۔ کیا اس کی کوئی قیمت لگائی جا سکتی ہے؟ ہم جس ہوا میں سانس لیتے ہیں کیا اس کی کوئی قیمت ہے؟ ہم زندہ رہیں گے۔ ہم پانی پییں گے۔ ہم ریاست گجرات کو نئی بلندیوں پر پہنچائیں گے۔''

—— گجرات کے وزیر اعلیٰ کی بیوی اُرمیلا بین پٹیل،
1993، دہلی میں ایک عام جلسے سے خطاب کرتے ہوئے۔

''جب ڈیم بنے گا تو ہم آپ لوگوں سے اپنے مکان چھوڑ کر ہٹ جانے کو کہیں گے۔ اگر آپ خود سے ہٹ جائیں تو اچھا ہوگا۔ دوسری صورت میں ہم پانی کھول دیں گے اور آپ سب کو ڈبو دیں گے۔''

——مرار جی دیسائی، 1961 میں پونگ ڈیم کے سلسلے میں زیر آب آنے والے علاقے میں ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے۔

''یہ لوگ ہمیں زہر کیوں نہیں دے دیتے؟ اس طرح ہم بھی ان غلیظ بلوں میں رہنے سے چھوٹ جائیں گے اور سرکار اپنے قیمتی ڈیم کے ساتھ آرام سے رہ سکے گی۔''

——رام بائی، جس کا گاؤں نرمداندی پر بننے والے باگڑی ڈیم کے پانی میں ڈوب گیا۔ وہ اب جبل پور کی ایک پچھڑی بستی میں رہتی ہے۔

آزادی کے بعد کے پچاس برسوں میں، نہرو کی مشہور تقریر "ڈیم نئے بھارت کے مندر ہیں" کے بعد (یہ وہی تقریر ہے جس پر نہرو کو خود اپنی زندگی میں پچھتانا پڑا) اس کے سپاہیوں نے غیر فطری جوش و جذبے کے ساتھ خود کو نئے ڈیم تعمیر کرنے کے کام پر لگا دیا۔ ڈیم کی تعمیر قوم کی تعمیر کے مترادف سمجھی جانے لگی۔ ان کا یہ غیر معمولی جوش ہی دیکھنے والے کو شک وشبے میں ڈالنے کے لیے کافی تھا۔ نہ صرف انھوں نے نئے ڈیم اور آبپاشی کے نئے نظام تعمیر کیے بلکہ جن چھوٹے، روایتی نظاموں کو دیہی آبادیاں ہزاروں سال سے برقرار رکھتی چلی آئی تھیں، ان کو اپنے کنٹرول میں لے کر ان کا گلا گھونٹ دیا۔ اس نقصان کی تلافی کرنے کے لیے سرکار مسلسل نئے ڈیم بناتی رہی — بڑے ڈیم، چھوٹے ڈیم، اونچے اور نیچے ڈیم۔ ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہے کہ آج بھارت ڈیم تعمیر کرنے والے ملکوں میں دنیا میں تیسرے نمبر پر ہے۔ سنٹرل واٹر کمیشن کے مطابق ہمارے ملک میں 3600 ڈیم ایسے ہیں جنھیں بڑے ڈیموں کے زمرے میں شمار کیا جا سکتا ہے، اور ان میں سے 3300 آزادی کے بعد تعمیر کیے گئے ہیں۔ ایسے ایک ہزار ڈیم ابھی زیرِ تعمیر ہیں۔ اس کے باوجود ہماری آبادی کا پانچواں حصہ — یعنی 20 کروڑ لوگ — پینے کے صاف پانی تک رسائی نہیں رکھتا اور دو تہائی حصہ — یعنی 60 کروڑ افراد — گندے پانی کے نکاس کی سہولتوں سے محروم ہے۔

بڑے ڈیموں کی شروعات اچھی تھی لیکن انجام برا ہوا۔ ایک وقت تھا جب ہر کوئی انھیں اچھا سمجھتا تھا، سب ملک انھیں حاصل کرنا چاہتے تھے — کمیونسٹ، سرمایہ دار، عیسائی، مسلمان، ہندو، بودھ۔ ایک وقت تھا جب بڑے ڈیم آدمی کے شاعرانہ تخیل کو مہمیز کرتے تھے۔ اب ایسا نہیں ہے۔ ساری دنیا میں بڑے ڈیموں کے خلاف تحریک زور پکڑ رہی ہے۔ ترقی یافتہ دنیا میں ان کا استعمال ختم کیا جا رہا ہے، انھیں بارود سے اڑایا جا رہا ہے۔ یہ بات اب محض مفروضہ نہیں رہی کہ بڑے ڈیم فائدے سے زیادہ نقصان کا سبب بنتے ہیں۔ بڑے ڈیم فرسودہ ہو چکے ہیں۔ اب ان کا رواج نہیں رہا۔ بڑے ڈیم غیر جمہوری ہیں۔ ان کے ذریعے سے سرکاریں اپنے اقتدار کو مستحکم کرتی ہیں اور اس قسم کے فیصلے اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہیں کہ کس کو کتنا پانی ملے گا اور کون کہاں کون سی فصل اگائے گا۔ یہ کسان سے اس کی دانش چھین لینے کا یقینی طریقہ ہے۔ بڑے ڈیم پانی، زمین اور آبپاشی کے وسائل کو غریبوں سے چھین کر امیروں کو عطا کر دینے کا ایک بے حیا طریقہ ہیں۔ ان کے آبی ذخیرے لوگوں کے بڑے

بڑے گروہوں کو ان کی جگہ سے اکھاڑ کر انھیں بے گھر اور بے روزگار کر دیتے ہیں۔ ماحولیاتی اعتبار سے انھیں ناقابلِ برداشت پایا گیا ہے۔ وہ زمین کو ضائع کر دیتے ہیں۔ ان کے باعث سیلاب آتے ہیں، زمین میں سیم اور تھور پیدا ہوتا ہے، لوگوں میں بیماریاں پھیلتی ہیں۔ اس بات کی شہادتیں روز بروز بڑھ رہی ہیں کہ زلزلوں کا بھی بڑے ڈیموں سے تعلق ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بڑے ڈیم جدید تہذیب کی یادگاروں، فطرت پر انسان کی فتح کی نشانیوں کے طور پر اپنا کردار ادا نہیں کر سکے۔ یادگاروں کو وقت کے اثرات سے آزاد سمجھا جاتا ہے، جبکہ ڈیموں کی زندگی کا عرصہ نہایت محدود ہوتا ہے۔ ان کی عمر صرف اتنی ہوتی ہے جتنا وقت فطرت انھیں ریت سے بھر دینے میں لگاتی ہے۔ یہ بات اب عام طور پر معلوم ہے کہ بڑے ڈیموں کی پبلسٹی کرنے والے ان کے بارے میں جو کچھ کہتے ہیں وہ اس کا بالکل الٹ عمل کرتے ہیں؛ قومی فائدے کے لیے مقامی قربانی کا اسطورہ اب پارہ پارہ ہو چکا ہے۔

یہی تمام اسباب ہیں کہ ترقی یافتہ دنیا میں ڈیم سازی کی صنعت مشکلات کا شکار اور بے روزگار ہے۔ چنانچہ اسے ترقیاتی امداد کے نام تیسری دنیا کو برآمد کر دیا جاتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے اس دنیا کی دیگر ناکارہ چیزیں ــــــ پرانے ہتھیار، قدیم طیارہ بردار جہاز اور ممنوع کیڑے مار دوائیں ــــــ ہماری طرف روانہ کر دی جاتی ہیں۔

ایک طرف تو بھارت سرکار ــــــ ہر بھارت سرکار ــــــ اپنی حق پرستی کے نشے میں سرشار ہو کر ترقی یافتہ دنیا کے خلاف خطابت کے جوہر دکھاتی ہے، اور دوسری طرف تحفوں کے طور پر پیک کیا ہوا یہ تمام کوڑا کرکٹ باقاعدہ قیمت ادا کر کے خریدتی ہے۔ ترقیاتی امداد بھی درحقیقت ایک طرح کا روبار ہے۔ بالکل ویسا ہی جیسا نوآبادیاں قائم کرنے کا کاروبار تھا۔ اس کاروبار نے افریقہ کے بیشتر حصے کو تباہ کر ڈالا ہے۔ بنگلہ دیش کو اس دوا کی خوراکوں سے غش آ رہا ہے۔ ہم سب کو یہ باتیں لرزہ طاری کر دینے والی تفصیل کے ساتھ معلوم ہیں۔ اس کے باوجود ہمارے دیس کے رہنما ترقیاتی امداد اپنے چہروں پر غلامانہ مسکراہٹ سجا کر قبول کرتے ہیں (اور اپنے ذلت کے احساس کو کم کرنے کے لیے ایٹمی ہتھیار بناتے ہیں)۔

پچھلے پچاس برسوں میں بھارت نے صرف آبپاشی کے شعبے پر 80 ارب روپے خرچ کیے

ہیں۔ اس کے باوجود آج خشک سالی اور سیلاب کا شکار ہونے والے علاقوں کی تعداد 1947 کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ آبپاشی کے نظام کے نتیجے میں ہونے والے سانحوں، ڈیموں کے باعث آنے والے سیلابوں، اور سبز انقلاب کے طریقوں سے بڑھتی ہوئی ناامیدی (گرتی ہوئی پیداوار، زمین کی خراب حالت) کے باوجود سرکار نے آج تک اپنے 3600 ڈیموں میں سے کسی ایک کا بھی بعداز تعمیر مطالعہ نہیں کروایا ہے جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ اس سے جو نتائج متوقع تھے وہ حاصل ہوئے یا نہیں، ان پر جو لاگت آئی وہ ان کے فوائد کے اعتبار سے جائز تھی یا نہیں، اور یہ کہ ان پر آنے والی لاگت دراصل کتنی تھی۔

بھارت سرکار کے پاس اس کے تفصیلی اعداد و شمار موجود ہیں کہ ملک میں خوردنی تیل کتنے ملین ٹن کی مقدار میں پیدا ہوتا ہے، اور اس کی پیداوار میں 1947 سے اب تک کتنا اضافہ ہوا ہے۔ سرکار آپ کو یہ بھی بتا سکتی ہے کہ سال بھر میں کتنا باکسائٹ کانوں سے نکالا جاتا ہے یا قومی شاہراہوں کا کل رقبہ کتنا ہے۔ سٹاک ایکسچینج کی بابت یا عالمی منڈی میں بھارتی روپے کی بدلتی ہوئی قدر کے بارے میں ایک ایک منٹ کی اطلاع حاصل کرنا ممکن ہے۔ ہم جان سکتے ہیں کہ ہماری کرکٹ ٹیم نے شارجہ میں جمعے کے دن کھیلے جانے والے کتنے میچ ہارے۔ یہ معلوم کرنا بھی زیادہ دشوار نہیں کہ کسی مخصوص سال میں بھارت نے کتنے گریجویٹ پیدا کیے یا کتنے افراد نے اپنا ویسکٹومی (نس بندی) کا آپریشن کرایا۔ لیکن بھارت سرکار کے پاس اُن لوگوں کے بارے میں کوئی اعداد و شمار نہیں جن کو کسی ڈیم کی تعمیر کے نتیجے میں بے گھر یا کسی دوسری طرح 'قومی ترقی' پر قربان ہونا پڑا۔ کیا یہ حیرت کی بات نہیں؟ آپ ترقی کو کس طرح ناپ سکتے ہیں اگر آپ کو اس پر آنے والی لاگت کا اندازہ نہ ہو اور یہ نہ معلوم ہو کہ یہ قیمت کس نے ادا کی؟ خوراک، کپڑا، بجلی، پائپ کا پانی — 'منڈی' ان چیزوں کی قیمت کس طرح متعین کر سکتی ہے اگر وہ اس حساب میں ان چیزوں کی اصل پیداواری لاگت ہی کو شامل نہ کرے؟

انڈین انسٹیٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن کی جانب سے کیے جانے والے 54 ڈیموں کے مطالعے کے نتائج کے مطابق، ہر بڑے ڈیم کے تعمیر سے بے گھر ہونے والے لوگوں کی اوسط تعداد 44182 ہے۔ مانا کہ 3300 میں سے صرف 54 ڈیم تجزیے کے لیے ناکافی نمونہ ہیں، لیکن چونکہ ہمارے پاس اس کے سوا کوئی اعداد و شمار نہیں، اس لیے آیئے انھی کی بنیاد پر سادہ سا حساب لگانے کی

کوشش کریں۔ احتیاط سے کام لیتے ہوئے ہم اس تعداد کو نصف کر لیتے ہیں۔ انتہائی احتیاط سے کام لیتے ہوئے آیئے ہم اس تعداد کو کم کر کے صرف دس ہزار بے گھر افراد فی ڈیم کر لیں۔ میں جانتی ہوں کہ یہ ایک ناقابلِ یقین حد تک قلیل تعداد ہے، لیکن... ٹھیک ہے۔ آیئے اپنے اپنے کیلکولیٹر نکال لیں۔ 3300 ضرب 10000 مساوی...

3 کروڑ 30 لاکھ۔ حاصل ضرب یہی نکلتا ہے۔ تین کروڑ تیس لاکھ لوگ۔ یہ لوگ پچھلے پچاس سال میں صرف بڑے ڈیموں کی تعمیر کے نتیجے میں بے گھر ہوئے — ہزاروں دوسرے ترقیاتی منصوبوں کی بھینٹ چڑھنے والے لوگ ان کے علاوہ ہیں۔ پلاننگ کمیشن کے سیکرٹری این سی سکسینہ نے ایک پرائیوٹ لیکچر میں کہا کہ ترقی پر قربان ہونے والوں کی تعداد اس کے خیال میں تقریباً پانچ کروڑ ہے (جن میں سے چار کروڑ لوگ ڈیموں کی نذر ہوئے)۔ ہم اس عدد کو منھ سے نکالنے کی ہمت نہیں کر سکتے کیونکہ یہ سرکاری تعداد نہیں ہے۔ یہ سرکاری تعداد اس لیے نہیں کہ ہم میں اسے منھ سے نکالنے کی ہمت نہیں۔ ہم اسے اندر ہی اندر بدبداتے ہیں، ڈرتے ہیں کہ کہیں ہم پر مبالغہ آمیزی کا الزام نہ لگ جائے۔ ہم اسے اپنے آپ سے سرگوشی میں کہتے ہیں، کیونکہ یہ تعداد ناقابلِ یقین معلوم ہوتی ہے۔ ایسا نہیں ہوسکتا، میں خود سے کہتی رہی ہوں۔ میں نے ضرور صفر لگانے میں کہیں غلطی کر دی ہوگی۔ یہ سچ نہیں ہوسکتا۔ مجھ میں اس تعداد کو بلند آواز میں ادا کرنے کا حوصلہ نہیں ہے۔ خود کو 1960 کی دہائی کا ہپی قرار دلوانے کی تاب نہیں ہے جو یہ کہہ کر ہر چیز پر تیزاب ڈال دیتے ہیں کہ "سب نظام کا قصور ہے!" شیزوفرینیا کا مریض ہونے کا طعنہ سننے کا حوصلہ نہیں ہے۔ لیکن اگر اس صورت حال میں نظام کا نہیں تو پھر کس کا قصور ہے؟

پانچ کروڑ لوگ۔

سرکار اس تعداد کو چیلنج کرے۔ اسے گھٹائے، بھاؤ تاؤ کرے — کچھ تو کہے!

میں یوں محسوس کر رہی ہوں جیسے چلتے چلتے اچانک کسی اجتماعی قبر پر آ نکلی ہوں۔

پانچ کروڑ کی تعداد پوری ریاست گجرات کی آبادی سے زیادہ ہے۔ آسٹریلیا کی کل آبادی کا تقریباً تین گنا ہے۔ بھارت کی تقسیم کے وقت نقل مکانی پر مجبور ہونے کی کل تعداد کے تین گنا سے زیادہ ہے۔ فلسطینی پناہ گزینوں کی کل تعداد کا دس گنا ہے۔ پوری مغربی دنیا آج ان دس لاکھ افراد کے مستقبل

کے لیے فکرمند ہے جنھیں کو سوود میں اپنے گھروں سے نکلنا پڑا۔

ترقی کی بھینٹ چڑھنے والے ان لوگوں میں بڑی تعداد آدی واسیوں کی ہے (سردار سروور ڈیم کے سلسلے میں بے گھر ہونے والوں میں 57.6 فیصد لوگ آدی واسی ہیں۔) ان میں اگر نچلی ذات والے دلتوں کو بھی شامل کر لیا جائے تو یہ تناسب فحش کی حد کو جا پہنچتا ہے۔ شیڈولڈ کاسٹس اینڈ ٹرائبز کے کمشنر کے مطابق یہ تناسب تقریباً 60 فیصد بنتا ہے۔ اگر آپ اس حقیقت کو پیش نظر رکھیں کہ بھارت کی آبادی میں آدی واسی صرف 8 فیصد اور دلت 15 فیصد ہیں تو اس کہانی کا ایک بالکل نیا پہلو سامنے آ جاتا ہے۔ یہ حقیقت کہ شکار ہونے والے نسلی اعتبار سے 'غیر' ہیں، 'قوم کی تعمیر کرنے والوں' پر سے دباؤ کو کسی حد تک کم کر دیتی ہے۔ یہ بالکل کسی اور کے خرچ پر خریداری کرنے کی طرح ہے۔ بل کوئی اور ادا کرے گا۔ کسی دوسرے دیس کے لوگ۔ کسی دوسری دنیا کے لوگ۔ بھارت کے غریب ترین باشندے اس دیس کے امیر ترین باشندوں کی پرتعیش زندگی کا خرچ برداشت کر رہے ہیں۔

کیا میں نے ابھی ابھی کسی کو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کے بارے میں کچھ کہتے سنا ہے؟

اُن پانچ کروڑ لوگوں کا کیا بنا؟ وہ اب کہاں ہیں؟ وہ اپنی روزی کیسے حاصل کرتے ہیں؟ کوئی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ (پچھلے مہینے کے اخباروں میں چھپا تھا کہ ناگارجن ساگر ڈیم کے منصوبے کے نتیجے میں بے گھر ہونے والے آدی واسی کس طرح اپنے نوزائیدہ بچے گود لینے والے غیر ملکی اداروں کے ہاتھ فروخت کر رہے تھے۔ سرکار نے مداخلت کی اور ان بچوں کو دو سرکاری اسپتالوں میں داخل کر دیا گیا، جہاں چھ بچے عملے کی غفلت کا شکار ہو کر ہلاک ہو گئے۔) جب بحالی اور باز آبادکاری کی بات آتی ہے تو سرکار کی ترجیحات بالکل واضح ہیں۔ ایسی کسی پالیسی کا وجود نہیں۔ لینڈ ایکویزیشن ایکٹ (1894) کے مطابق سرکار بے گھر ہونے والے کسی فرد کو نقد معاوضے کے سوا کچھ بھی دینے کی مکلف نہیں ہے۔ نقد معاوضے کا ذرا تصور کیجیے۔ ایک ایسے دیس میں جہاں ڈاکیہ ڈاک لانے کے صلے میں بخشش کا مطالبہ کرتا ہے، بھارت سرکار کا ایک اہلکار ایک ناخواندہ آدی واسی مرد کو (عورتیں کچھ پانے کی حقدار نہیں ہیں) نقد معاوضے کی ادائیگی کرے گا! بیشتر آدی واسیوں کے پاس زمین کی ملکیت کے کاغذات موجود نہیں ہیں، اس لیے وہ کسی معاوضے کا مطالبہ یوں بھی نہیں کر سکتے۔ پھر یہ کہ بیشتر آدی واسیوں کے لیے (بلکہ بیشتر چھوٹے کسانوں کے لیے بھی) نقد رقم اتنی ہی کارآمد ہے جتنی کھاد کی بوری

سپریم کورٹ کے کسی جج کے لیے کارآمد ہو سکتی ہے۔

بے گھر ہونے والوں میں سے لاکھوں لوگ اب ختم ہو چکے ہیں۔ جب تاریخ لکھی جائے گی تو وہ اس کا حصہ نہیں ہوں گے۔ اعداد و شمار کے طور پر بھی نہیں۔ ان میں سے بعض کو تین تین چار چار بار اپنی جگہ سے اُکھڑنا پڑا — ایک ڈیم، توپ خانے کی مشق کا میدان، ایک اور ڈیم، یورینیم کی کان، پھر بجلی گھر۔ ایک بار ان کے قدم اکھڑ جائیں تو پھر دم لینے کو رکنا محال ہے۔ ان لوگوں کی اکثریت آخر کار ان غلیظ بستیوں میں آ بسی جو ہمارے عظیم شاندار شہروں کے حاشیوں پر واقع ہیں، اور کم اجرت پانے والے تعمیراتی مزدوروں کے ہجوم میں شامل ہو گئی (یہ مزدور نئے پروجیکٹ تعمیر کریں گے جن سے مزید لوگ بے گھر ہوں گے۔) یہ درست ہے کہ ان لوگوں کا قتل عام نہیں کیا جا رہا، نہ انھیں گیس چیمبر میں بھیجا جا رہا ہے، لیکن میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ جن حالات میں وہ رہ رہے ہیں وہ نازی جرمنی کے کسی کنسنٹریشن کیمپ کی حالت سے بدتر ہیں۔ وہ قید میں نہیں ہیں، لیکن ان کی حالت دیکھ کر قید اور آزادی کے معنی نئے سرے سے متعین کرنے ہوں گے۔

اور یہ بھیانک خواب یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ جب کبھی الیکشن کافی دور ہوں اور شہر کے متمول باشندوں کو صحت اور صفائی کی فکر سوجھی ہو تو سرکاری بلڈوزر انھیں ان کے جہنمی بلوں تک سے بے دخل کرنے کو آ پہنچتے ہیں۔ دہلی جیسے شہروں میں انھیں عوامی مقامات پر ہگتے ہوئے پولیس کی گولی سے ہلاک ہو جانے کا خوف لاحق رہتا ہے — ابھی دو سال بھی نہیں ہوئے کہ تین افراد کو اس جرم میں گولی سے اڑا دیا گیا تھا۔

1770 کی دہائی میں ہونے والی فرانسیسی کینیڈین جنگوں میں لارڈ ایمہرسٹ نے چیچک کے جراثیم سے بھرے کمبل عطیے میں دے کر کینیڈا کے قدیم انڈین لوگوں کی اکثریت کو ہلاک کر دیا تھا۔ اس کے دو سو برس بعد ہم، اصل انڈیا کے رہنے والوں نے وہی مقصد حاصل کرنے کے کم واضح طریقے سیکھ لیے ہیں۔

بھارت کے بے گھر ہونے والے یہ کروڑوں باشندے ایک غیر اعلان کردہ جنگ کا شکار ہوئے ہیں۔ اور ہم، وائٹ امریکہ یا فرنچ کینیڈا یا ہٹلر کے جرمنی کے شہریوں کی طرح، نظریں چرا کر اس عمل کو جائز قرار دے رہے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ ہمیں بتایا گیا ہے کہ یہ کام عظیم تر اجتماعی بھلائی کے لیے کیا

جا رہا ہے۔ اسے ترقی کے نام پر اور قومی مفاد کے نام پر (جو ظاہر ہے کہ مقدم ہے!) انجام دیا جاتا ہے، چنانچہ ہم خوشی خوشی، کوئی سوال کیے بغیر، بلکہ تقریباً ممنونیت کے جذبے کے ساتھ ہر اس بات پر یقین کر لیتے ہیں جو ہمیں بتائی جاتی ہے۔ ہم اس پر بھی یقین کر لیتے ہیں کہ ان باتوں پر یقین کرنے سے ہم فائدے میں رہیں گے۔

آیئے میں آپ کے اس یقین کو تھوڑا سا ڈگمگا دوں۔ ہاتھ تھام کر آپ کو دھند کے اُس پار لے چلوں۔ میرے ساتھ چلیے کیونکہ یہ بہت ضروری ہے کہ آپ اصل بات کو سمجھیں۔ اگر آپ کو مجھ سے اختلاف کرنے میں معقولیت نظر آئے تو ضرور دوسرے فریق کے ساتھ ہو جایئے۔ لیکن خدارا، اس معاملے کو نظر انداز نہ کریں، اس سے چشم پوشی نہ کریں۔

یہ کہانی سنانا آسان کام نہیں ہے۔ اس میں بہت سے اعداد و شمار اور وضاحتیں آتی ہیں۔ کچھ عرصے پہلے تک خود میری نظریں بھی اعداد و شمار پر سے پھسل کر آگے چلی جاتی تھیں۔ لیکن اب ایسا نہیں ہوتا۔ جب سے میں نے اُس سمت میں دیکھنا شروع کر دیا جدھر یہ اعداد و شمار اشارہ کرتے ہیں۔

مجھ پر یقین کیجیے۔ ان اعداد و شمار میں ایک کہانی موجود ہے۔

یہ درست ہے کہ بھارت نے ترقی کی ہے۔ یہ درست ہے کہ 1947 میں، جب نوآبادیاتی نظام رسمی طور پر ختم ہوا، بھارت میں اناج کی قلت تھی۔ 1950 میں ہم نے 51 ملین ٹن اناج پیدا کیا۔ اب ہماری اناج کی پیداوار 200 ملین ٹن ہے۔ یہ درست ہے کہ 1995 میں سرکاری گوداموں میں 30 ملین ٹن اناج بھرا ہوا تھا جو بیچا نہیں جا سکا تھا۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ ٹھیک اُسی وقت بھارت کی آبادی میں 40 فیصد لوگ —— 35 کروڑ سے زیادہ افراد —— غربت کی لکیر سے نیچے زندہ تھے۔ یہ تعداد 1947 میں بھارت کی کل آبادی سے زیادہ ہے۔

بھارت کے رہنے والے اس قدر غریب ہیں کہ اپنے ہی دیس کا پیدا کیا ہوا اناج نہیں خرید پاتے۔ بھارت واسیوں کو اس قسم کی خوراک پیدا کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے جسے کھانے کی وہ خود استطاعت نہیں رکھتے۔ دیکھیے مغربی اڑیسہ کے کالاہانڈی ضلعے میں، جو بھوک سے مرنے کے واقعات کے لیے مشہور ہے، کیا ہوا۔ 1996 میں پڑنے والے سوکھے میں لوگ ہلاک ہوئے (سرکاری ذرائع کے مطابق 16، اخباروں کے مطابق 100 سے زیادہ)، لیکن اسی سال اس ضلعے میں چاول کی پیداوار

قومی اوسط سے زیادہ رہی! چاول کالاہانڈی سے مرکز کو بھیجا گیا۔

بھارت نے یقیناً ترقی کی ہے لیکن یہاں کے بیشتر باشندوں نے بالکل ترقی نہیں کی۔

ہمارے لیڈر کہتے ہیں کہ ہمیں چین اور پاکستان سے بچاؤ کے لیے ایٹمی اسلحے کی ضرورت ہے۔ لیکن ہمیں اپنے آپ سے کون بچائے گا؟

یہ کس قسم کا دیس ہے؟ اس کا مالک کون ہے؟ اس کا چلانے والا کون ہے؟ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟

وقت آ گیا ہے کہ کچھ سرکاری راز افشا کر دیے جائیں۔ ''نااہل، بداطوار، بدعنوان لیکن آخرکار مہربان، بنیادی طور پر جمہوری بھارتی ریاست'' کے تصور کے غبارے میں پن چبھو دی جائے۔ پانچ کروڑ لوگوں کا خاتمہ کسی غفلت کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ نہ ان کے کرموں کا پھل ہو سکتا ہے۔ ہمیں خود کو فریب نہیں دینا چاہیے۔ یہ باقاعدہ منظم، بھرپور، سفاکانہ اور مکمل طور پر انسانی ارادے سے کیا جانے والا عمل ہے۔

بھارتی ریاست کوئی ایسی ریاست نہیں ہے جو ناکام ہو گئی ہو۔ اس ریاست کو اپنے متعینہ مقصد حاصل کرنے میں متاثر کن کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اس نے بھارت کے وسائل —— زمین، پانی، جنگلوں، مچھلیوں، گوشت اور انڈوں، اور ہوا —— پر قبضہ کرنے اور انھیں (بلاشبہ پسندیدہ افعال کے بدلے میں) پسندیدہ اقلیت کو عطا کرنے میں غیر معمولی کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اسے اپنے کھائے پیے مراعات یافتہ طبقے کی حفاظت کرنے میں مکمل مہارت حاصل ہے۔ اور اُن سب لوگوں کو خاک میں ملانے میں بھی جو اس کے ارادوں کی راہ میں رکاوٹ بننے کی کوشش کریں۔ لیکن اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی وہ اپنا خوشگوار تاثر قائم رکھے ہوئے ہے۔ اپنے رازوں کی کامیابی سے حفاظت کر رہی ہے اور ان اطلاعات کو نہایت خوبی سے پھیلنے سے روکے ہوئے ہے جن کا تعلق ایک ارب انسانوں کی روزمرہ زندگی سے ہے! ان رازوں کو ان فائلوں میں قید کیے ہوئے ہے جن تک صرف ان افراد کو دسترس حاصل ہے جو کام کو آگے بڑھانے کے ذمے دار ہیں —— یعنی وزیر، بیوروکریٹ، سرکاری انجینئر، دفاعی ماہرین۔ بلاشبہ ہم، جو اس عمل سے فائدہ اٹھانے والے ہیں، ان کے لیے یہ سب کرنا اُور بھی آسان بنا دیتے ہیں۔ ہم ان رازوں کی زیادہ کرید نہیں کرتے۔ ہم دراصل ان گھناؤنی تفصیلات میں جانا ہی نہیں چاہتے۔

یہ ہماری ہی بدولت ہے کہ آزادی آئی (اور گئی)، الیکشن آتے ہیں اور گزر جاتے ہیں، لیکن تاش کی گڈی کو کبھی پھینٹا نہیں جاتا۔ اس کے برعکس پرانے نظام، قدیم تقسیم کو تقدیس کا درجہ حاصل ہو گیا ہے۔ ہم، حکومت کرنے والے افراد، اپنی کاغذوں سے اٹی میزوں سے کبھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھیں گے۔ غالباً ہم نہیں جانتے کہ جن وسائل کی ہم دعوت اڑا رہے ہیں وہ محدود ہیں اور تیزی سے ختم ہو رہے ہیں۔ بینک میں رقم موجود ہے، لیکن بہت جلد اس کے ذریعے خریدی جا سکنے والی چیزیں ختم ہو جائیں گی۔ باورچی خانے میں کھانا ختم ہو رہا ہے۔ اور ملازموں نے تو ابھی کھایا ہی نہیں۔ بلکہ انھیں کھانا ملنا تو کب کا بند ہو چکا ہے۔

بھارت اپنے دیہات میں رہتا ہے — ہمیں ہر باوقار سرکاری تقریر میں یہی بتایا جاتا ہے۔ یہ محض بکواس ہے۔ یہ سرکار کی ٹھساٹھس بھری وارڈ روب میں سے نکالا ہوا انجیر کا پتا ہے۔ بھارت اپنے دیہات میں رہتا نہیں، بھارت اپنے دیہات میں مرتا ہے۔ بھارت اپنے دیہات میں ذلیل ہوتا ہے اور ٹھوکریں کھاتا ہے۔ بھارت دراصل اپنے شہروں میں رہتا ہے۔ بھارت کے دیہات صرف اس لیے ہیں کہ اس کے شہروں کی خدمت کریں۔ بھارت کے گاؤں والے اس کے شہریوں کے چاکر ہیں اور اسی لیے انھیں قابو میں رکھنا اور زندہ رکھنا ضروری ہے، لیکن صرف زندہ رکھنا، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

ہمارے ذہنوں میں ریاست کا جو تصور ہے — کہ وہ بیچاری اپنے زبردست مسائل کے انبار کے بوجھ تلے دبی جا رہی ہے اور ان سے نمٹنے کی کوشش میں ہلکان ہو رہی ہے — وہ ایک خطرناک تصور ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ریاست مسئلے کو جنم دے رہی ہے۔ یہ غریبی پیدا کرنے کی ایک عظیم الجثہ مشین ہے، اپنی ان ترکیبوں میں پوری طرح طاق کہ کس طرح غریبوں کو ان سے زیادہ غریب لوگوں سے بھڑایا جائے، کس طرح مفلس اور کنگال لوگوں کے سامنے روٹی کے چند ٹکڑے پھینکے جائیں تاکہ وہ اپنی توانائیاں آپس میں لڑنے میں صرف کردیں اور مالکوں کے محل میں امن وامان (اور اشتہار بازی) کا راج بنا رہے۔

جب تک اس عمل کو درست طور پر پہچان نہیں لیا جاتا، جب تک اس کی طرف رخ کر کے اس پر براہ راست حملہ نہیں کیا جاتا، تب تک انتخابات — خواہ وہ کتنے ہی سخت جوش کے ساتھ لڑے جائیں — محض جعلی مقابلے رہیں گے جن کا مقصد صرف یہ ہے کہ ناقابل بیان نابرابری کو مزید مستحکم کیا

جائے۔ تب تک جمہوریت (یعنی اس کا وہ روپ جو ہمارے یہاں رائج ہے) صرف ایک مہربان نقاب رہے گی جس کے پیچھے ایک ہولناک طاعون ہر چیلنج سے محفوظ رہے گا۔ اور اس طاعون کا پھیلاؤ ایسا ہے کہ اس کے سامنے تمام پرانی جنگیں اور پچھلی سب مصیبتیں لیبارٹری میں کیے گئے محدود تجربات معلوم ہوں گی۔ اب تک کم از کم پانچ کروڑ افراد ترقی کی اس مشین میں ڈالے جا چکے ہیں اور دوسری جانب سے ایرکنڈیشنر اور پوپ کورن اور ریان بن کر باہر نکلے ہیں، اور دوسروں کے استعمال میں آنے والی ان تمام نعمتوں کا خرچ بھی انھی بدنصیب لوگوں نے برداشت کیا ہے۔ (اگر ہمیں ان عمدہ چیزوں کا شوق ہے تو ہمیں ان کی قیمت تو ادا کرنی چاہیے۔)

پرچم میں ایک سوراخ ہے جسے رفو کی ضرورت ہے۔

یہ کہنا بڑی غمناک بات ہے، لیکن جب تک ہمارا یقین برقرار ہے اس وقت تک ہمارے لیے کوئی امید نہیں۔ امید کرنے کے قابل ہونے کے لیے ہمیں اپنے یقین کو توڑنا پڑے گا۔ ہمیں مخصوص لڑائیاں مخصوص طریقوں سے لڑنا ہوں گی، اور ہمیں یہ لڑائیاں جیتنی ہوں گی۔

تو اب سنیے نرمدا وادی کی کہانی۔ اسے سمجھیے اور اگر چاہیں تو اس کی لڑائی میں شامل ہونے کے لیے اپنا نام لکھوائیے۔ کسے معلوم کہ اس میں جادو کا اثر پیدا ہو جائے!

نرمدا ندی مدھیہ پردیش کے شاہدول ضلعے میں امرکنٹک کے پٹھار [سطح مرتفع] سے شروع ہوتی ہے اور چوڑے پتوں والے حسین جنگل، اور شاید بھارت کی سب سے زیادہ زرخیز زرعی زمین میں ڈیڑھ ہزار کلومیٹر کا فاصلہ طے کرتی ہے۔ اس کی وادی میں ڈھائی کروڑ لوگ بستے ہیں جو اس ماحولیاتی نظام کے ساتھ، اور ایک دوسرے کے ساتھ، باہمی انحصار کے ایک پیچیدہ رشتے کے وسیلے سے منسلک ہیں۔ (بلاشبہ اس رشتے میں استحصال کا عنصر بھی شامل ہے۔) اگرچہ نرمدا ندی کو 'آبی وسائل کی ترقی' کے لیے پچاس برس پہلے ہی منتخب کر لیا گیا تھا، لیکن اب سے کچھ عرصے پہلے تک اس کے قبضے میں آنے اور پارہ پارہ کر دیے جانے سے محفوظ رہنے کی وجہ یہ تھی کہ یہ ندی تین ریاستوں —— مدھیہ پردیش، مہاراشٹر اور گجرات —— میں سے گزرتی ہے۔ (درحقیقت اس کا نوے فیصد حصہ مدھیہ پردیش میں ہے؛ مہاراشٹر کی یہ صرف شمالی سرحد کو چھوتی ہے، اور اس کے بعد گجرات میں تقریباً 180

کلو میٹر بہنے کے بعد بھروچ کے مقام پر بحیرۂ عرب میں جا گرتی ہے۔)

1946 ہی میں منصوبہ تیار کر لیا گیا تھا کہ اس ندی پر گجرات میں گورا کے مقام پر ڈیم تعمیر کیا جائے۔ 1961 میں نہرو نے 49.8 میٹر اونچے ڈیم کا سنگ بنیاد رکھا — یہ چھوٹا ڈیم بعد میں آنے والے سردار سرو ور ڈیم کا پیشرو تھا۔ تقریباً اسی زمانے میں سروے آف انڈیا نے ندی کے طاس (basin) کے علاقے کے نئے، جدید جغرافیائی نقشے تیار کیے۔ گجرات کے ڈیم کے منصوبہ سازوں نے ان نئے نقشوں کا مطالعہ کر کے فیصلہ کیا کہ اس سے بہت بڑا ڈیم بنانا زیادہ منافع بخش ہوگا۔ لیکن اس کے لیے ہمسایہ ریاستوں کے ساتھ کسی سمجھوتے پر پہنچنا ضروری تھا۔

تینوں ریاستوں کے مابین بہت بحث و تکرار ہوئی لیکن پانی کی تقسیم کے مسئلے پر کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ آخر کار 1969 میں مرکزی سرکار نے نرمدا کے پانی کے تنازعات کا ٹریبونل قائم کیا۔ اس ٹریبونل کو اپنے فیصلے کا اعلان کرنے میں دس برس لگے۔ جن لوگوں کی زندگیاں اس منصوبے کے نتیجے میں تہہ و بالا ہو جانے والی تھیں انھیں اس بارے میں نہ کوئی اطلاع دی گئی نہ ان سے مشورہ کیا گیا اور نہ ان کو اپنی بات کہنے کا موقع دیا گیا۔

ندی کے پانی کے حصے بخرے کرنے کے لیے ٹریبونل کا سب سے پہلا کام یہ معلوم کرنا تھا کہ ندی میں پانی کی مقدار کتنی ہے۔ عموماً پانی کی مقدار کا درست اندازہ لگانے کے لیے ضروری ہے کہ ندی میں پانی کے بہاؤ کے چالیس سال کے اعداد و شمار موجود ہوں۔ چونکہ یہ اعداد و شمار دستیاب نہیں تھے، اس لیے ٹریبونل نے بارش کی مقدار کے اعداد و شمار کی بنیاد پر اندازہ لگانے کا فیصلہ کیا۔ اس طریقے سے انھوں نے ندی میں پانی کی مقدار کا تخمینہ 27.22 ملین ایکڑ فٹ لگایا۔ یہ تخمینہ نرمدا وادی کے تمام منصوبوں کی بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہم اب تک اسی کے ورثے کے ساتھ جی رہے ہیں۔ پانی کی مقدار کے اسی تخمینے کی بنیاد پر آبپاشی کے اس پورے منصوبے کے مجموعی ڈیزائن کا تعین کیا گیا ہے — ڈیموں کی اونچائی، محل وقوع اور کل تعداد۔ اس سے نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ یہ تخمینہ اس بات کا بھی تعین کرتا ہے کہ پورے منصوبے پر آنے والی لاگت کیا ہوگی، زمین کا کتنا رقبہ زیرِ آب آئے گا، کتنے لوگوں کو اپنی جگہ سے بے دخل ہونا پڑے گا، اور منصوبوں سے کیا فوائد حاصل ہوں گے۔ 1992 میں، جب نرمدا میں پانی کے بہاؤ کے اعداد و شمار کا پچھلے 44 سال کا ریکارڈ دستیاب تھا، یہ معلوم ہوا کہ ندی میں پانی کی مقدار

صرف 22.69 ملین ایکڑ فٹ ہوگی — یعنی تخمینے سے 18 فیصد کم! پانی کا مرکزی کمیشن اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ نرمدا میں پانی کی مقدار اس تخمینے سے کم ہے جو پہلے تیار کیا گیا تھا۔ لیکن بھارت سرکار کا کہنا ہے کہ ٹریبونل کے فیصلے کی شق نمبر 2 پر، جس میں نرمدا میں پانی کے قابلِ انحصار بہاؤ کا تخمینہ 28 ملین ایکڑ فٹ لگایا گیا ہے، نظرِ ثانی نہیں کی جا سکتی!

دوسرے لفظوں میں نرمدا ندی قانونی طور پر اس انسانی حکم کی پابند ہے کہ اتنی مقدار میں پانی پیدا کرے جو بھارت سرکار کی مقرر کی ہوئی ہے!

نرمدا وادی کا آبی منصوبہ تیار کرنے والوں کا دعویٰ ہے کہ یہ کسی ندی کی وادی کے لیے تیار کیا جانے والا انسانی تاریخ کا سب سے بڑا منصوبہ ہے۔ انھوں نے اس ندی پر تین ہزار دو سو ڈیم تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا ہے جو نرمدا اور اس سے نکلنے والی 41 نہروں کی ماہیت کو بدل کر انھیں زینوں دار آبی ذخیروں کے ایک سلسلے کی شکل دے دیں گے — مطیع و فرمانبردار پانی کا ایک عظیم زینہ۔ ان ڈیموں میں سے 30 بڑے، 135 درمیانے اور باقی چھوٹے ڈیم ہوں گے۔ بڑے ڈیموں میں سے دو کثیر المقاصد عظیم ڈیم ہوں گے۔ گجرات میں واقع سردار سرو وَر ڈیم اور مدھیہ پردیش کے علاقے میں نرمدا ساگر ڈیم مجموعی طور پر پانی کا اتنا بڑا ذخیرہ قائم کریں گے جو برصغیر کے کسی بھی دوسرے آبی ذخیرے سے بڑا ہوگا۔

آپ کسی بھی زاویے سے دیکھیں، نرمدا وادی کا ترقیاتی منصوبہ بہت بڑا منصوبہ ہے۔ یہ منصوبہ بھارت کی ایک بہت بڑی ندی کے طاس کے علاقے کا پورا ماحولیاتی نظام بدل ڈالے گا۔ یہ ان ڈھائی کروڑ لوگوں کی زندگی پر اثر انداز ہوگا جو اس وادی کے باسی ہیں۔ اس کے باوجود، ماحولیات کی وزارت سے منصوبے کو منظور کیے جانے سے پہلے ہی ورلڈ بینک نے منصوبے کے بنیادی جز، یعنی سردار سرو وَر ڈیم کو مالی اعانت فراہم کرنے کی پیشکش کر دی — وہ سردار سرو وَر ڈیم جس کے باعث مدھیہ پردیش اور مہاراشٹر میں لوگ بے گھر ہوں گے اور گجرات والوں کو اس کا فائدہ پہنچے گا۔ اس سے پہلے کہ منصوبے کی لاگت کا تخمینہ لگایا جاتا، منصوبے کا گہرائی سے مطالعہ کیا جاتا، کوئی شخص جان پاتا کہ اس منصوبے کی ماحولیاتی اور انسانی قیمت کیا ہوگی، ورلڈ بینک اپنی چیک بک کے ساتھ مستعد کھڑا تھا!

سردار سرو وَر ڈیم کے منصوبے کے لیے 45 کروڑ ڈالر کا قرض 1985 میں منظور کر کے حاضر کر

دیا گیا تھا۔ ماحولیات کی وزارت سے منصوبے کی منظوری 1987 میں آئی! آپ جوش و جذبے کی بات کرتے ہیں، یہ تو کوئی آسمانی مشن معلوم ہوتا ہے! کیا کوئی اس سے زیادہ مہربان ہو سکتا ہے؟

ورلڈ بینک اس قدر بے تاب کیوں تھا؟

1947 سے 1994 تک کے عرصے میں ورلڈ بینک کو دنیا بھر سے قرضوں کی چھ ہزار درخواستیں موصول ہوئیں۔ ان میں سے کوئی ایک درخواست بھی مسترد نہیں کی گئی۔ کوئی ایک درخواست بھی نہیں! اس طرح دیکھیں تو 'پیسے کو گردش میں لانا' اور 'قرضوں کے ہدف حاصل کرنا' جیسی اصطلاحات کے معنی ایک دم سمجھ میں آنے لگتے ہیں۔

آج بھارت ایسی صورتحال میں ہے کہ وہ بینک کو سود اور اصل زر کی ادائگی میں اس سے زیادہ رقم ادا کرتا ہے جتنی اسے بینک سے وصول ہوتی ہے۔ ہمیں پرانے قرض چکانے کے لیے نئے قرض لینے پڑتے ہیں۔ ورلڈ بینک کی سالانہ رپورٹ کے مطابق پچھلے برس (1998 میں)، تمام حساب کتاب کے بعد، بھارت نے بینک کو جو ادائگی کی وہ بھارت کو وصول ہونے والی رقم سے 47 کروڑ 8 لاکھ ڈالرز زیادہ تھی۔ پچھلے پانچ برسوں یعنی 1993 سے 1998 تک کے عرصے میں بھارت نے ورلڈ بینک کو ایک ارب 47 کروڑ پانچ لاکھ ڈالرز زائد ادا کیے۔ ہمارا اور ورلڈ بینک کا رشتہ بالکل وہی ہے جو قرض میں بری طرح دھنسے ہوئے بے زمین کھیت مزدور اور گاؤں کے سود خور مہاجن کے درمیان ہوتا ہے — یہ ایک شفقت بھرا رشتہ ہے؛ غریب کسان اپنے مہاجن سے محبت کرتا ہے کیونکہ وہ ضرورت کے وقت مدد کو ہمیشہ موجود ہوتا ہے۔ آخر دنیا کو عالمی گاؤں بلا وجہ تو نہیں کہا جاتا۔ بے زمین کھیت مزدور اور بھارت سرکار کے درمیان صرف اتنا فرق ہے کہ ایک اس قرض کو زندہ رہنے کے لیے استعمال کرتا ہے، اور دوسرا اسے اپنے افسروں اور دلالوں کے ذاتی خزانوں میں منتقل کر دیتا ہے اور اس عمل میں ملک کو ایسی معاشی غلامی میں دھکیل دیتا ہے جس سے وہ شاید کبھی نہ ابھر سکے۔

ڈیم سازی کی بین الاقوامی صنعت کی مالیت 20 بلین ڈالر سالانہ ہے۔ اگر آپ دنیا بھر میں بڑے ڈیموں کی تعمیرات کا احتیاط سے مشاہدہ کریں تو آپ جہاں کہیں جائیں گے — چین، جاپان، ملائیشیا، تھائی لینڈ، برازیل، گواتے مالا — آپ کا سامنا ایک ہی کہانی سے ہوگا، ایک جیسے کرداروں سے آپ کی ملاقات ہوگی: 'آہنی تکون'، (جو ڈیم سازی کی اصطلاح میں سیاست دانوں، سرکاری

افسروں، ڈیم ساز کمپنیوں کے گٹھ جوڑ کا دوسرا نام ہے)، خود کو 'بین الاقوامی ماحولیاتی کنسلٹنٹ' کہلانے والے نوسرباز (جو عموماً ڈیم ساز کمپنیوں یا ان کی ذیلی کمپنیوں کے براہ راست ملازم ہوتے ہیں)، اور بیشتر صورتوں میں آپ کے گاؤں کا مہربان مہاجن یعنی ورلڈ بینک۔ رفتہ رفتہ آپ اس بلند آہنگ خطابت کو، 'عوامی ڈیم' کے انھی معزز نعروں کو پہچاننے لگیں گے، اور اس تیز رفتار اور وحشیانہ جبر کو بھی جو عوامی نافرمانبرداری کے نمودار ہوتے ہی فوراً حرکت میں آ جاتا ہے۔ (کچھ عرصے سے، خصوصاً نرمدا وادی کے تجربے کے بعد سے، ورلڈ بینک ان ملکوں کے انتخاب میں زیادہ احتیاط برتنے لگا ہے جہاں اسے ایسے منصوبوں کے لیے مالی امداد فراہم کرنی ہو جن سے بڑی تعداد میں لوگ بے دخل ہونے والے ہوں۔ اس وقت چین اس کا سب سے پسندیدہ گاہک ہے۔ یہ ہمارے زمانے کی عجیب ستم ظریفی ہے — امریکی شہری تیانن من چوک میں ہونے والے قتل عام پر احتجاج کرتے ہیں، لیکن ورلڈ بینک تھری گورجز ڈیم کے اس منصوبے کی تعمیر پر اپنی رقم لگا رہا ہے جس کے باعث 13 لاکھ لوگ بے گھر ہو جائیں گے۔)

یہ ایک نہایت ماہرانہ سرکس ہے اور کرتب دکھانے والے ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ ایک دوسرے کے ساتھ اپنے کردار بدل لیتے ہیں — بیوروکریٹ بینک کی ملازمت اختیار کر لیتا ہے، بینکر اچانک کنسلٹنٹ کے روپ میں نمودار ہوتا ہے۔ جس رقم کو 'ترقیاتی امداد' کا نام دیا جاتا ہے، کھیل کے اختتام پر اس کا بڑا حصہ آلات کی لاگت، کنسلٹنٹ کی فیس یا امدادی اداروں کے عملے کی تنخواہوں کی شکل میں واپس ان ملکوں کے پاس پہنچ جاتا ہے جہاں سے یہ رقم روانہ ہوئی تھی۔ اکثر صورتوں میں 'امداد' کھلے بندوں 'مشروط' ہوتی ہے (جیسا کہ سردار سرووَر ڈیم کے سلسلے میں فراہم کی جانے والی جاپانی امداد، جو اس بات سے مشروط ہے کہ ٹربائن سومی تومو کارپوریشن سے خریدی جائیں گی)۔ بعض صورتوں میں اس کی پشت پر خفیہ مفاد ہوتا ہے۔ 1993 میں برطانیہ نے ملائیشیا کے پرگاؤ ڈیم کی تعمیر کے لیے 234 ملین پاؤنڈ کا ارزاں قرض فراہم کیا جبکہ اوورسیز ڈویلپمنٹ ایڈمنسٹریشن کی رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ یہ ڈیم ملائیشیا کے لیے نقصان دہ سودا ثابت ہوگا۔ بعد میں کھلا کہ یہ قرض فراہم کرنے کا مقصد ملائیشیا کی حوصلہ افزائی کرنا تھا کہ وہ 1.3 بلین پاؤنڈ کے برطانوی ہتھیار خریدنے کے معاہدے پر دستخط کر دے۔

1994 میں برطانوی کنسلٹنٹس نے سمندر پار کے معاہدوں سے 2.5 بلین پاؤنڈ کمائے۔ پروجیکٹ مینجمنٹ کے شعبے کے بعد ان معاہدوں کا سب سے بڑا جز ماحولیاتی اثرات کے جائزے (Environmental Impact Assessments) تیار کرنے کا کام تھا۔ ترقیاتی کام کے دھندے کے اصول خاصے سادہ ہیں۔ اگر آپ کو کسی سرکار نے کسی بڑے ڈیم کے منصوبے کے لیے ماحولیاتی اثرات کا جائزہ تیار کرنے کا کام سونپا، اور آپ نے اس منصوبے میں کسی مسئلے کی نشاندہی کردی (مثلاً آپ نے ندی میں پانی کی مقدار کے تخمینے پر کوئی اعتراض کردیا یا، خدانخواستہ، آپ نے کہیں یہ کہہ دیا کہ منصوبے کی انسانی قیمت غالباً بہت زیادہ ہے) تو پھر آپ تاریخ کا حصہ بن جائیں گے، ایک بے روزگار کنسلٹنٹ کہلائیں گے۔ اور ساری نعمتیں جو آپ کو حاصل ہیں — لینڈ روور جیپ، تسکنی میں آرام دہ تعطیلات، آپ کے بچوں کا شاندار بورڈنگ سکول — سب ہوا ہو جائیں گی۔ غریبی کے کام میں بہت پیسہ ہے۔ اور پرکشش مراعات اس کے علاوہ۔

بڑے ڈیموں کی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے 138.68 میٹر اونچے سردار سرور ڈیم کی تعمیر کے پہلو بہ پہلو سرکار کی طرف سے منصوبے کی اصل لاگت کا تخمینہ اور ماحول اور انسانوں پر اس کے ممکنہ اثرات کا اندازہ کرنے کے سلسلے میں مطالعاتی جائزوں کا ناٹک بھی شروع ہوا۔ ورلڈ بینک نے بھی اس ڈرامے میں دل و جان سے حصہ لیا — کبھی کبھی اس کی تیوری پر ہلکا سا بل پڑتا اور وہ PAPs یعنی منصوبے سے متاثر ہونے والے لوگوں (Project Affected People) کی بازآبادکاری اور بحالی کے سلسلے میں مزید معلومات فراہم کرنے کی نرم سی درخواست کرتا۔ (PAPs جیسے مخفف بہت کارآمد ہوتے ہیں؛ ان کے ذریعے گوشت اور خون کو سرد اعداد و شمار میں بدلا جا سکتا ہے۔ بہت جلد PAPs انسان ہونا ترک کردیتے ہیں۔) ان درخواستوں کے جواب میں تھوڑی بہت اطلاعات فراہم کردی جاتیں جن سے بینک مطمئن ہو جاتا اور کام آگے چل پڑتا۔

متعلقہ اداروں کے درمیان اَن کہا، اَن لکھا، لیکن بالکل ظاہر سمجھوتہ یہ تھا کہ منصوبے کی اقتصادی، ماحولیاتی یا انسانی قیمت خواہ کچھ بھی ہو، یہ جاری رہے گا؛ اسے آگے بڑھاتے ہوئے وہ اس کے مختلف پہلوؤں کا جواز پیش کرتے رہیں گے۔ وہ بہت اچھی طرح جانتے ہیں کہ آخرکار کسی عدالت یا کسی کمیٹی کے سامنے کوئی دلیل اس سے زیادہ کارگر نہیں ہو سکتی کہ منصوبہ تکمیل کے قریب ہے۔ (ی

لارڈ، منصوبے میں تاخیر سے ملک کو دو کروڑ یومیہ کا نقصان ہو رہا ہے!) سرکار سردار سرور ڈیم کے منصوبے کو Most Studied Project in India قرار دیتی ہے، اس کے باوجود کھیل کچھ اس طرح کھیلا جاتا ہے:

جب ٹربیونل نے اپنے فیصلے کا اعلان کیا، اور اس کے ساتھ ہی گجرات سرکار نے اپنے منصوبے کا اعلان کیا کہ وہ اپنے حصے میں آنے والے پانی کو کس طرح استعمال کرے گی، تب گجرات کے بنجر علاقوں سوراشٹر اور کچھ میں واقع دیہاتوں کو پینے کی فراہمی کا کوئی ذکر نہ کیا گیا۔ مگر جب منصوبہ سیاسی مشکلات کا شکار ہوا، سرکار نے اچانک پیاس کی جذباتی قوت کو دریافت کیا۔ اچانک سوراشٹر اور کچھ میں سوکھے گلوں کی پیاس بجھانا سردار سرور ڈیم کی تعمیر کا اصل مقصد بن گیا۔ (اس بات کو نظر انداز کر دیجیے کہ جو دو ندیاں نرمدا کے مقابلے میں سوراشٹر اور کچھ سے میلوں قریب ہیں ـــــ یعنی سابرمتی اور ماہی ـــــ ان دونوں ندیوں پر ڈیم بنا کر ان کے پانی کا رخ احمد آباد، مہسانہ اور کھیدا کی طرف موڑ دیا گیا ہے۔ سوراشٹر اور کچھ کو ان دریاؤں کے پانی میں سے ایک قطرہ بھی نہیں ملا۔) جن لوگوں کو سردار سرور کینال سے پینے کا پانی فراہم کیا جائے گا ان کی سرکاری تعداد گھٹتی بڑھتی رہی ہے: 1983 میں یہ 28 ملین تھی، 1989 میں 32.5 ملین ہو گئی (اعشاریہ کا استعمال قابلِ داد ہے!)، 1992 میں بڑھ کر 40 ملین تک جا پہنچی اور 1993 میں گھٹ کر پھر 25 ملین پر آ گئی۔ جن دیہاتوں کو پینے کا پانی ملے گا ان کی تعداد 1979 میں صفر تھی، 1980 کے عشرے کی ابتدا میں 4719 ہو گئی، 1990 میں 7234 تک جا پہنچی اور 1991 میں 8215 ہو گئی۔ جب چیلنج کیا گیا تو سرکار نے اعتراف کیا کہ 1991 کے اعداد و شمار میں 236 غیر آباد گاؤوں کو بھی شامل کر لیا گیا تھا!

اس منصوبے کے ہر پہلو کو اسی غیر سنجیدہ اور تحقیر آمیز طریقے سے لیا گیا ہے، جیسے یہ گھر میں بیٹھ کر کھیلا جانے والا کوئی بورڈ گیم ہو۔ اس کے باوجود کہ یہ منصوبہ بہت بڑی تعداد میں لوگوں کی زندگی اور مستقبل کو متاثر کرنے والا ہے۔

جو خاندان سردار سرور کے آبی ذخیرے کے باعث بے گھر ہوں گے 1979 میں ان کی تعداد کا تخمینہ چھ ہزار سے کچھ زیادہ لگایا گیا تھا۔ 1987 میں یہ تعداد بارہ ہزار ہوئی، 1991 میں 27 ہزار تک پہنچی، 1992 میں سرکار نے اعلان کیا کہ 40 ہزار خاندان اس سے متاثر ہوں گے۔ آج یہ تعداد 40

ہزار اور 41 ہزار 500 کے درمیان کہیں واقع ہے۔ (ظاہر ہے کہ یہ تعداد بھی بالکل لغو ہے، کیونکہ ذخیرۂ آب اس منصوبے کا وہ واحد حصہ نہیں ہے جس کے باعث لوگ بے گھر ہوں گے۔ نرمدا بچاؤ آندولن کے مطابق اس منصوبے کی زد میں آنے والے خاندانوں کی تعداد 85 ہزار ہے — یعنی پانچ لاکھ یا نصف ملین افراد!)

منصوبے پر آنے والی لاگت کا تخمینہ چھ ہزار کروڑ روپے سے اچانک اچھل کر بیس ہزار کروڑ روپے تک جا پہنچا (یہ سرکاری اعداد وشمار ہیں)۔ این بی اے کا کہنا ہے کہ اس منصوبے پر چالیس ہزار کروڑ روپے لاگت آئے گی۔ (یہ رقم پچھلے پچاس برس میں آبپاشی کے شعبے میں ملکی سطح پر خرچ کی جانے والی کل رقم کے نصف کے برابر ہے۔)

سرکار کا دعویٰ ہے کہ سردار سرودر منصوبے سے 1450 میگاواٹ بجلی پیدا ہوگی۔ سردار سرودر جیسے کثیر المقاصد ڈیموں کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ ان کے 'مقاصد' (آبپاشی، بجلی کی پیداوار اور سیلابوں کی روک تھام) ایک دوسرے کے متضاد ہوتے ہیں۔ آبپاشی میں وہ پانی خرچ ہو جاتا ہے جس کی مدد سے بجلی پیدا کی جانی تھی۔ سیلاب کی روک تھام کے مقصد کا تقاضا ہوتا ہے کہ مون سون کے مہینوں میں ذخیرۂ آب کو بالکل خالی رکھا جائے تاکہ سیلاب کے پانی کو سمیٹا جا سکے۔ اور اگر سیلاب نہ آیا تو آپ کے پاس خالی تالاب رہ جائے گا، اور اس سے آبپاشی کا مقصد فوت ہو جائے گا جس کا تقاضا ہے کہ مون سون کے پانی کا ذخیرہ کیا جائے۔ یہ بالکل اس معمے کی طرح ہے جس میں ایک لومڑی، ایک مرغی اور غلے کے تھیلے کو ندی پار لے جانا ہوتا ہے۔ ایک دوسرے سے ٹکرانے والے ان مقاصد کا انجام، مطالعاتی جائزوں کی رو سے، یہ ہے کہ جب سردار سرودر منصوبہ مکمل ہوگا اور اس کے تمام اجزا کام میں آنے کے قابل ہوں گے تو یہ تخمینے کے مقابلے میں صرف تین فیصد بجلی پیدا کر سکے گا — محض پچاس میگاواٹ۔

یہ ایک قدیم جنگ ہے۔ ہر شخص کا اپنا الگ مفاد ہے۔ تو پھر آپ ان تمام دعووں اور جوابی دعووں کے جنگل میں سے اپنا راستہ کیونکر تلاش کریں گے؟ یہ فیصلہ کیسے کریں گے کہ کس کا تخمینہ زیادہ قابلِ اعتبار ہے؟ اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ بھارت میں بنائے جانے والے ڈیموں کے ریکارڈ کا جائزہ لیا جائے۔

❁

جبل پور کے قریب واقع باگڑی ڈیم نرمدا ندی پر مکمل ہونے والا (1990) پہلا ڈیم تھا۔ اس پر تخمینے سے دس گنا زیادہ لاگت آئی اور اس کے نتیجے میں انجینئروں کے لگائے ہوئے اندازے سے تین گنا زمین زیرِ آب آئی۔ تخمینہ لگایا گیا تھا کہ 101 گاؤوں کے تقریباً ستر ہزار لوگ بے دخل ہوں گے، لیکن جب ذخیرے میں پانی بھرا گیا (لوگوں کو کوئی اطلاع دیے بغیر) تو 162 گاؤں زیرِ آب آ گئے۔ سرکار نے بے دخل ہونے والوں کو بسانے کے لیے جو آبادیاں قائم کی تھیں ان میں سے بھی کئی ڈوب گئیں۔ لوگوں کو اس زمین سے جہاں وہ صدیوں سے آباد تھے، چوہوں کی طرح کھدیڑ نکالا گیا۔ انھوں نے جلدی میں جو کچھ بچا سکتے تھے بچایا اور بے بس کھڑے اپنے مکانوں کو پانی کے ریلوں میں بہتا دیکھتے رہے۔ ایک لاکھ 14 ہزار لوگ بے گھر ہوئے۔ ان کی بحالی کی کوئی پالیسی موجود نہیں تھی۔ ان میں سے بعض کو حقیر نقد معاوضہ دیا گیا۔ بیشتر کو کچھ بھی نہیں ملا۔ چند ایک کو سرکار کی قائم کی ہوئی بستیوں میں جگہ دی گئی۔ سرکار کی پبلسٹی کے مطابق گورکھپور کی بستی 'مثالی آبادی' ہے۔ 1990 اور 1992 کے درمیان وہاں پانچ آدمی بھوک سے ہلاک ہوئے۔ باقی لوگ آبی ذخیرے کے پاس کے جنگلوں میں غیر قانونی طور پر آباد ہونے کے لیے واپس لوٹ گئے یا جبل پور کی پسماندہ آبادیوں میں جا بسے۔ باگڑی ڈیم صرف اتنے رقبے تک پانی پہنچا سکا جو اس کے باعث زیرِ آب آیا تھا اور جو اس کے منصوبہ سازوں کے تخمینوں اور دعووں کے مقابلے میں صرف پانچ فیصد کے برابر تھا۔ اور یہ رقبہ بھی سیم کا شکار ہے۔

بار بار یہی کہانی دہرائی جاتی ہے۔ آندھرا پردیش کی آبپاشی کی سکیم نمبر 2 کے سلسلے میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ اس کے نتیجے میں صرف 63 ہزار لوگ بے دخل ہوں گے۔ تکمیل کو پہنچنے تک ڈیڑھ لاکھ لوگ بے گھر ہو چکے تھے۔ گجرات میڈیم اریگیشن 2 کے منصوبے کے نتیجے میں 63 ہزار 600 نہیں بلکہ ایک لاکھ 40 ہزار لوگ بے دخل ہوئے۔ کرناٹک میں اپر کرشنا کی آب رسانی کی اسکیم کے نتیجے میں بے گھر ہونے والوں کی تعداد دو لاکھ 40 ہزار تھی جبکہ اندازہ صرف 20 ہزار کا لگایا گیا تھا۔

یہ سب اعداد و شمار نرمدا بچاؤ آندولن کے نہیں بلکہ ورلڈ بینک کے ہیں۔ اندازہ کیجیے کہ اس طرح ہمارا تین کروڑ تیس لاکھ متاثرین کا محتاط تخمینہ کہاں تک جا پہنچتا ہے!

سردار سرور ڈیم پر تعمیراتی کام، جو 1961 سے وقتاً فوقتاً چل رہا تھا، 1988 میں باقاعدہ شروع ہوگیا۔ اس وقت کسی کو بھی پتا نہ تھا ـــــ نہ سرکار کو اور نہ ورلڈ بینک کو ـــــ کہ میدھا پاٹکر نامی ایک عورت ان دیہاتوں میں گھوم رہی ہے جنھیں غرقاب ہونے کے لیے نشان زد کرلیا گیا تھا اور لوگوں سے پوچھتی پھر رہی ہے کہ کیا انھیں کچھ خبر ہے کہ سرکار نے ان کے لیے کیا منصوبے بنا رکھے ہیں۔ اتنے برس پہلے جب وہ وادی میں پہنچی تھی تب ڈیم کی تعمیر کی مخالفت کرنے کا خیال اس کے ذہن کے آس پاس بھی کہیں نہ تھا۔ اسے بڑی فکر اس بات کی تھی کہ بے گھر ہونے والے دیہاتوں کو منصفانہ اور انسانی طریقے سے بسایا جائے۔ رفتہ رفتہ اس پر واضح ہوگیا کہ ان لوگوں کے بارے میں سرکار کے منصوبے کس قدر سفاکانہ ہیں۔ 1986 تک بات پھیل چکی تھی اور ہر ریاست میں لوگوں کی ایک ایک تنظیم قائم ہو چکی تھی جو بحالی اور بازآبادکاری کے سلسلے میں سرکاری اہلکاروں کے کیے ہوے وعدوں کو چیلنج کر رہی تھی۔ لیکن اس منصوبے کے ہاتھوں جو ہلاکت آنے والی تھی ـــــ بے دخل ہونے والوں پر بھی اور ان لوگوں پر بھی جنھیں اس سے فائدہ پہنچانے کا دعویٰ کیا جا رہا تھا ـــــ وہ کئی برس گزرنے کے بعد ظاہر ہوئی۔ نرمدا وادی کا ترقیاتی منصوبہ بھارت کے عظیم ترین منصوبہ بند ماحولیاتی سانحے کے طور جانا جانے لگا۔ مختلف تنظیمیں ایک تنظیم میں ضم ہوگئیں اور اس طرح نرمدا بچاؤ آندولن کی غیر معمولی تنظیم نے جنم لیا۔

1988 میں نرمدا بچاؤ آندولن نے باقاعدہ مطالبہ کیا کہ نرمدا وادی کے ترقیاتی منصوبے پر تعمیراتی کام روک دیا جائے۔ لوگوں نے اعلان کیا کہ اگر ضرورت پڑی تو وہ پانی میں غرق ہو جائیں گے لیکن اپنی جگہ سے نہیں ہٹیں گے۔ دو برس کے عرصے میں تحریک تیز ہوگئی اور اسے تمام دوسری مزاحمتی تحریکوں کی حمایت حاصل ہوگئی۔ ستمبر 1989 میں پورے بھارت سے کوئی پچاس ہزار لوگ وادی میں ہرسد کے مقام پر جمع ہوے اور انھوں نے اس تباہ کن ترقیاتی کام کے خلاف لڑنے کا عہد کیا۔ ڈیم کے تعمیراتی مقام اور اس کے اردگرد کے علاقے میں، جو پہلے ہی سے آفیشل سیکرٹس ایکٹ کی حفاظت میں تھا، دفعہ 144 نافذ کردی گئی جس کی رو سے پانچ سے زیادہ افراد کا اجتماع ممنوع قرار پایا۔ پورے علاقے کو ایک بہت بڑے پولیس کیمپ میں تبدیل کردیا گیا۔ ایک سال بعد، ستمبر 1990 میں، تمام رکاوٹوں کے باوجود، ہزاروں گاؤں والے پاپیادہ اور کشتیوں میں سوار ہو کر مدھیہ پردیش کے بادوانی نامی قصبے میں جمع ہوے اور اپنا یہ عہد دہرایا کہ وہ اپنے گھر چھوڑنے کے بجاے غرق ہونے کو ترجیح دیں

گے۔ لوگوں کی طرف سے اس منصوبے کی مخالفت کی خبریں دوسرے ملکوں تک بھی پہنچیں۔ 'دھرتی کے دوست' نامی تنظیم کی جاپانی شاخ نے ایک مہم چلائی جس کے نتیجے میں جاپان سرکار کو سردار سرو ور منصوبے کے لیے دی جانے والی 27 بلین ین کی امداد منسوخ کرنی پڑی۔ (لیکن ٹربائنوں کی خریداری کا معاہدہ اب بھی برقرار ہے۔) جاپانیوں کے پیچھے ہٹنے کے بعد احتجاج کا ساتھ دینے والے متعدد ماحولیاتی کارکنوں کے گروپوں نے ورلڈ بینک پر بین الاقوامی دباؤ بہت بڑھا دیا۔

اس کا نتیجہ بلاشبہ وادی میں جبر میں اضافے کی صورت میں نکلا۔ زبردست قوتِ اظہار رکھنے والے ایک وزیر کے لفظوں میں، سرکار نے یہ پالیسی اختیار کی کہ وادی میں "خاکی وردیوں کا سیلاب لے آیا جائے۔"

1990 میں کرسمس کے دن تقریباً چھ ہزار مردوں اور عورتوں نے اپنی ضرورت کی چیزیں اور بستر اپنے سر پر اٹھا کر سو کلومیٹر سے زیادہ فاصلہ پیدل طے کیا۔ قربانی دینے والے سات افراد کا گروپ ان کے ساتھ تھا جس نے ندی کے بچاؤ کے لیے اپنی جان قربان کرنے کا عہد کر رکھا تھا۔ گجرات کی سرحد پر واقع فرکوا کے مقام پر انھیں مسلح پولیس کی بٹالینوں نے اور بڑودہ سے آئے ہوئے لوگوں کے ہجوم نے روک دیا۔ اس ہجوم میں شامل بہت سے افراد کرائے پر لائے گئے تھے اور کچھ شاید واقعی یہ یقین رکھتے تھے کہ سردار سرو ور منصوبہ 'گجرات کی شہ رگ' کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک دلچسپ مڈبھیڑ تھی۔ اوسط طبقے کا شہری بھارت دیہی، بیشتر آدی واسیوں پر مشتمل فوج کے سامنے صف آرا تھا۔ مارچ میں شامل لوگوں نے مطالبہ کیا کہ انھیں سرحد پار کر کے ڈیم کی تعمیر کے مقام تک جانے دیا جائے۔ پولیس نے انھیں آگے بڑھنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ اپنے عدم تشدد کے عہد پر زور دینے کے لیے ہر دیہاتی مرد اور عورت نے اپنے دونوں ہاتھ رسیوں سے باندھ رکھے تھے۔ وہ ایک کے بعد ایک پولیس کے احکام کی خلاف ورزی کرتے رہے۔ انھیں مارا پیٹا گیا اور گرفتار کر کے ان ٹرکوں میں ڈال دیا گیا جو قریب ہی منتظر کھڑے تھے اور جنھوں نے انھیں میلوں دور لے جا کر ویرانے میں چھوڑ دیا۔ وہاں سے وہ پیدل واپس آئے اور اپنی جدوجہد دوبارہ شروع کر دی۔

یہ صف آرائی کوئی دو ہفتے تک چلتی رہی۔ آخر کار 7 جنوری 1991 کو قربانی دینے والے دستے نے تادمِ مرگ بھوک ہڑتال شروع کرنے کا اعلان کیا۔ تناؤ خطرناک سطح تک جا پہنچا۔ بھارتی اور عالمی

پریس، ٹی وی کے کیمرا بردار عملے اور دستاویزی فلمیں بنانے والے بڑی تعداد میں وہاں موجود تھے۔ ہر روز اخباروں میں رپورٹیں شائع ہو رہی تھیں۔ واشنگٹن میں ماحولیاتی کارکنوں نے دباؤ اور بڑھا دیا تھا۔ آخر روشنیوں کی چکاچوند اور ساری دنیا میں ہونے والی منفی رپورٹنگ سے گھبرا کر ورلڈ بینک نے اعلان کیا کہ وہ سردار سرودر منصوبے کا جائزہ لینے کے لیے ایک آزاد کمیشن قائم کر رہا ہے —— ایک ایسا قدم جو ورلڈ بینک کی تاریخ میں کبھی نہیں اٹھایا گیا تھا۔

❂

جب یہ خبر وادی میں پہنچی تو اس کا استقبال عدم اعتماد اور بے یقینی کے ساتھ کیا گیا۔ لوگوں کے پاس ورلڈ بینک پر اعتماد کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ لیکن اس کے باوجود یہ ایک طرح کی فتح ضرور تھی۔ گاؤں والوں نے، جو اپنے بائیس دن سے بھوکے ساتھیوں کی حالت پر سخت فکرمند تھے، ان سے درخواست کی کہ اپنی بھوک ہڑتال ختم کر دیں۔ 28 جنوری کو فرکوا میں بھوک ہڑتال ختم کی گئی اور بہادر غیر مسلح فوج ''ہمارے گاؤں میں ہمارا راج!'' کے نعرے لگاتی اپنے گھروں کو لوٹ گئی۔

ایسی فوج دنیا بھر میں کوئی اَور نہ تھی۔ دوسرے ملکوں میں —— چین (جہاں چیئرمین ماؤ کو اس کی 77 ویں سالگرہ پر ایک ڈیم کا تحفہ دیا گیا)، برازیل، ملائشیا، گواتے مالا، پیراگوئے —— احتجاج کی ذرا سی رمق کو پیدا ہوتے ہی کچل دیا گیا تھا۔ بھارت میں احتجاج کی لہر جاری و ساری ہے۔ بلاشبہ ریاست اس کا سہرا بھی اپنے سر باندھنا چاہے گی۔ وہ چاہے گی کہ ہم اس کے شکرگزار ہوں کہ اس نے تحریک کو پوری طرح کچل نہیں ڈالا بلکہ اسے جاری رہنے دیا۔ آخر یہ ایک پھلتی پھولتی صحت مند جمہوریت کی نشانی نہیں تو اَور کیا ہے جس میں ریاست کو اسی وقت مداخلت کرنی پڑتی ہے جب اس کے عوام میں باہمی اختلافِ رائے پیدا ہو جائے؟

میں سمجھتی ہوں یہ صورتحال کو بیان کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ (کیا یہ مجھ میں پیدا ہونے والی نرمی کا اشارہ ہے؟ کیا میں یہ کہنا چاہتی ہوں: ''شکریہ، شکریہ، کہ تم نے مجھے یہ سطریں لکھنے کی اجازت دی''؟)

ہمیں احتجاج کی اجازت دینے کے لیے ریاست کا شکر گذار ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں اس کے لیے خود اپنا شکر گذار ہونا چاہیے۔ یہ ہم ہیں جنھوں نے اپنے حق پر اصرار کیا۔ ہم نے ان سے دستبردار ہونے سے انکار کیا۔ اگر ہم اجتماعی طور پر کسی بات پر فخر کر سکتے ہیں تو وہ یہ ہے: نرمدا وادی میں چلائی جانے والی تحریک ریاست کی کوششوں کے باوجود جاری ہے۔

بھارتی ریاست کے جنگ کرنے کے طریقے بڑے فریب کارانہ ہیں۔ اپنی ظاہری مہربانی کے علاوہ اس کا دوسرا بڑا ہتھیار یہ ہے کہ وہ انتظار کر سکتی ہے۔ گھونسوں کو بے اثر کرنے کے لیے فرش پر قلابازی کھا سکتی ہے۔ اپنے مخالفوں کو تھکا سکتی ہے۔ ریاست خود کبھی نہیں تھکتی، کبھی عمر رسیدہ نہیں ہوتی، اسے آرام کی کبھی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ اپنی کارروائی ہمیشہ جاری رکھ سکتی ہے۔

لیکن اس سے لڑنے والے لوگ تھک جاتے ہیں۔ وہ بیمار پڑتے، بوڑھے ہوتے جاتے ہیں۔ ان میں سے جو لوگ جوان ہیں وہ بھی وقت سے پہلے عمر رسیدہ ہو جاتے ہیں۔ پچھلے بیس برس سے، جب سے ٹربیونل کے فیصلے کا اعلان ہوا ہے، وادی کی غیر مسلح فوج بے دخل کر دیے جانے کے خوف کے ساتھ جی رہی ہے۔ بیس برس سے اس کے بیشتر علاقوں میں کوئی ترقیاتی کام نہیں ہوا ہے — نہ سڑکیں بنی ہیں نہ سکول، نہ کنویں نہ شفاخانے۔ بیس برس سے یہ فوج 'غرقابی' کے لیے نشان زد ہونے کی بدنامی کو سہہ رہی ہے جس نے اسے باقی پورے سماج سے کاٹ کر رکھ دیا ہے — رشتے نہیں آتے، نہ زمین کے سودے کیے جا سکتے ہیں۔ ان کی حالت ویسی ہے جیسی جاپان میں ہیروشیما اور ناگاساکی میں ایٹم بم سے بچ نکلنے والے 'ہیباکوشا' لوگوں اور ان کی اولادوں کی۔ 'جدید ترقی کے ثمرات' جب ان تک پہنچے تو دہشت میں بدل چکے تھے۔ جب سڑکیں بنیں تو ان پر چل کر سروییئر آ پہنچے۔ سروییئر اپنے ساتھ ٹرک لے کر آئے۔ ٹرکوں میں پولیس کے سپاہی تھے۔ پولیس والے اپنے ساتھ بندوقوں کی گولیاں اور تشدد اور بلاتکار اور گرفتاریاں اور (کم سے کم ایک واقعے میں) قتل لے کر آئے۔ جدید ترقی کا واحد ثمر جو ان تک انجانے میں پہنچا وہ ان کا آواز بلند کرنے کا، سنے جانے کا حق تھا۔ لیکن یہ لوگ بیس برس سے لڑ رہے ہیں۔ وہ اور کتنے دن باقی رہ سکتے ہیں؟

وادی میں چلنے والی تحریک تھکن کا شکار ہوتی جا رہی ہے۔ اس میں حصہ لینا ویسا فیشن ایبل بھی نہیں رہا جیسا پہلے تھا۔ بین الاقوامی کیمرا بردار عملہ اور جرأت مند رپورٹر اب (ورلڈ بینک کی طرح) بڑھ

کرنے میدانوں میں جا پہنچے ہیں۔ دستاویزی فلمیں دکھائی اور سراہی جا چکی ہیں۔ لوگوں کی ہمدردیاں صَرف ہو چکی ہیں۔ لیکن ڈیم کی تعمیر جاری ہے۔ وہ روز بروز اونچا ہوتا جا رہا ہے...

غیر مسلح فوج کو آج پہلے سے کہیں زیادہ کمک کی ضرورت ہے۔ اگر ہم نے اسے مرنے دیا، اس احتجاج کو کچل جانے دیا، لوگوں کو سزا پانے دیا تو ہم اپنی سب سے قیمتی شے سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے: ہمارا جذبہ، یا اس کا جو کچھ بھی باقی رہ گیا ہے۔

"بھارت چلتا رہے گا،" وہ آپ سے کہیں گے، دانا فلسفی جو کرنٹ افیئرز میں الجھ کر اپنا سکون برباد نہیں کرنا چاہتے۔ یوں لگتا ہے جیسے بھارت کسی طرح اس میں بسنے والے باشندوں سے زیادہ وقعت رکھتا ہو۔

پرانے نازی بھی خود کو ایسے ہی طریقوں سے دلاسا دیا کرتے ہوں گے۔

نرمدا وادی کے لیے لڑی جانے والی جنگ کوئی اجنبی آدمی واسی جنگ نہیں ہے، یہ کوئی بہت دور دراز کی یا محض بھارت کی جنگ بھی نہیں ہے۔ یہ دنیا کی ندیوں اور پہاڑوں اور جنگلوں کے بچاؤ کی جنگ ہے۔ پوری دنیا سے ہر قسم کے جنگ بازوں کا، ہر اس شخص کا خیر مقدم کیا جائے گا جو اس جنگ میں شامل ہونے پر آمادہ ہو۔ ہر قسم کے جنگ باز کی ضرورت پڑے گی۔ ڈاکٹر، وکیل، استاد، جج، صحافی، طالب علم، کھلاڑی، مصور، اداکار، گلوکار، محبت کرنے والے... سرحدیں کھلی ہیں، سب لوگ اندر چلے آئیں!

خیر، تو اب کہانی کی طرف لوٹتے ہیں۔

جون 1991 میں ورلڈ بینک نے اقوام متحدہ کے ترقیاتی پروگرام کے ایک سابق سربراہ بریڈفورڈ مورس کو آزادانہ جائزے کی ٹیم کا سربراہ مقرر کیا۔ اس کو سردار سرودر کا مکمل جائزہ لینے کا کام سونپا گیا۔ اسے اس منصوبے سے متعلق بینک کے تمام خفیہ کاغذات تک رسائی کی ضمانت دی گئی۔ ستمبر 1991 میں بریڈفورڈ مورس بھارت پہنچا۔ این بی اے نے، یہ سوچ کر کہ یہ بھی پہلے سے طے شدہ ایک ناٹک ہے، شروع میں اس سے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا۔ گجرات کی سرکار نے (سر ہلاتے اور آنکھ کا اشارہ کرتے ہوئے) ٹیم کا اپنے پوشیدہ ساتھیوں کے طور پر شاندار استقبال کیا۔ ایک برس بعد

آزادانہ جائزہ (جسے 'مورس رپورٹ' بھی کہا جاتا ہے) شائع ہوا۔ یہ رپورٹ نہایت احتیاط سے منصوبے کی پرتیں ایک ایک کر کے یوں کھولتی ہے جیسے پیاز کے چھلکے اتارے جاتے ہیں۔ اس نے کسی شے کو اتنا زیادہ بڑا یا اتنا زیادہ چھوٹا نہیں سمجھا کہ اس کا جائزہ نہ لیا جائے۔ اس کے ارکان وزیروں اور سرکاری افسروں سے ملے، انھوں نے علاقے میں کام کرنے والی این جی اوز سے ملاقات کی، وہ ایک ایک گاؤں، ایک ایک بحالی مرکز میں گئے۔ انھوں نے اچھی اور بری، عارضی اور مستقل، سب آبادیاں دیکھیں۔ انھوں نے سینکڑوں لوگوں سے بات کی۔ انھوں نے غرقاب ہونے والے اور منصوبے سے مجوزہ طور پر سیراب ہونے والے پورے علاقے کا دورہ کیا۔ وہ کچھ اور گجرات کے دوسرے سوکھے کے شکار علاقوں میں بھی گئے۔ انھوں نے اپنے جداگانہ مطالعاتی جائزے مرتب کیے۔ انھوں نے منصوبے کے ہر پہلو کا جائزہ لیا: ہائیڈرولوجی اور واٹر مینیجمنٹ، ندی کے بہاؤ کی مخالف سمت کا ماحول، ریت کی تہوں کے جمنے کے عمل، زیرِ اثر آنے والے رقبے کا تفاعل، بہاؤ کے رخ والی سمت کا ماحول، سیراب ہونے والے رقبے کے ممکنہ مسائل — سیم اور تھور، نکاس، صحت، جنگلی حیات پر پڑنے والے اثرات۔

مورس رپورٹ نپے تلے غیر جذباتی لہجے میں (جس کی میں مداح ہوں لیکن اسے اختیار کرنے میں ہمیشہ ناکام رہتی ہوں) جس بات کا انکشاف کرتی ہے وہ نہایت ہولناک ہے۔ یہ رپورٹ بھارت سرکار اور ورلڈ بینک کے مابین قائم رشتے کی نہایت متوازن، غیر جانبدار لیکن حددرجہ سخت فردِ جرم ہے۔ کسی شعوری کوشش کے بغیر، شاید غیر ارادی طور پر، یہ رپورٹ تہہ کو چیرتی ہوئی معاملے کے قلب تک جا پہنچتی ہے، اس مقام تک جہاں یہ دونوں فریق (اپنے قول اور فعل کے درمیان کہیں) ایک دوسرے کے ساتھ رہتے بستے اور مجامعت کرتے ہیں۔

357 صفحوں پر مشتمل اس آزادانہ جائزے کی بنیادی سفارش نہایت غیر مبہم اور غیر متوقع ہے:

> ''ہم سمجھتے ہیں کہ سردار سرووَر کا منصوبہ اپنی موجودہ صورت میں ناقص ہے، کہ ان ڈیموں کی تعمیر کے نتیجے میں بےدخل ہونے والے لوگوں کی بازآبادکاری اور بحالی موجودہ صورتحال میں ممکن نہیں ہوگی، اور یہ کہ منصوبے سے ہونے والے ماحولیاتی اثرات کا مناسب طور سے جائزہ نہیں لیا گیا ہے اور نہ ان کا کوئی حل ڈھونڈا گیا ہے۔ مزید برآں، ہمارے خیال میں اس منصوبے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتحال کے لیے قرض لینے والے ملک کے ساتھ ساتھ ورلڈ بینک بھی ذمے دار ہے... یہ

بات واضح معلوم ہوتی ہے کہ منصوبے کے تکنیکی اور اقتصادی پہلوؤں نے تمام انسانی اور ماحولیاتی تفکرات کو پس پشت ڈال دیا ہے... بھارتی سرکار اور متعلقہ ریاستی سرکاروں نے... بھاری رقم خرچ کی ہے۔ کوئی بھی اس رقم کو ڈوبتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتا۔ لیکن ہم خبردار کرتے ہیں کہ منصوبے کی انسانی اور ماحولیاتی قیمت کا مکمل علم حاصل کیے بغیر منصوبے کو جاری رکھنا کہیں زیادہ ضیاع کا سبب بنے گا۔ ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہمارے لیے یہ ایک غیر ذمہ دارانہ عمل ہوگا کہ ہم منصوبے کے نفاذ کے طریقے کے سلسلے میں سفارشات مرتب کریں جبکہ منصوبے کے نقائص اس قدر واضح ہوں جیسے کہ وہ ہمارے سامنے واضح ہیں۔ چنانچہ ہمارا خیال ہے کہ بینک کے لیے سب سے دانشمندانہ کام یہ ہوگا کہ اس منصوبے سے اپنا قدم پیچھے ہٹالے اور اس کا نئے سرے سے جائزہ لے۔ منصوبے پر ایک ایک قدم کر کے آگے بڑھنے کی بینک کی حکمت عملی کی ناکامی کو تسلیم کیا جانا چاہیے۔"

ان چار کمیٹڈ، باعلم اور سچ آزاد افراد نے اس یقین کو دوبارہ مستحکم کرنے میں بہت بڑا کردار انجام دیا جوان سینکڑوں دوسرے زر پرست افراد کے ہاتھوں متزلزل ہو چکا تھا جنھوں نے اسی طرح آزادانہ جائزے تیار کرنے کے لیے رقم وصول کی تھی۔

تاہم بینک اب بھی ہتھیار ڈالنے کو تیار نہ تھا۔ اس نے منصوبے کی مالی امداد جاری رکھی۔ دو مہینے بعد بینک نے 'پامیلا کوکس کمیٹی' کو بھیجا جس نے ٹھیک وہی کام کیا جس کے کرنے سے 'مورس رپورٹ' نے خبردار کیا تھا۔ اس نے منصوبے کو رفو کرنے کی غرض سے بہت سی تجویزیں پیش کیں تاکہ کام کو جاری رکھا جا سکے۔ اکتوبر 1992 میں 'پامیلا کوکس کمیٹی' کی سفارش پر بینک نے بھارت سرکار سے چھ ماہ کے عرصے میں چند کم سے کم، بنیادی شرائط پوری کرنے کو کہا۔ لیکن سرکار اس قدر قلیل شرائط بھی پوری نہ کر سکی۔ آخرکار 30 مارچ 1993 کو ورلڈ بینک نے خود کو سردار سرور منصوبے سے الگ کر لیا۔ (دراصل، تکنیکی طور پر، 29 مارچ کو، یعنی بینک کی دی ہوئی میعاد کو ختم ہونے سے ایک دن پہلے، بھارت سرکار نے ورلڈ بینک سے خود درخواست کی تھی کہ وہ منصوبے سے دستبردار ہو جائے۔) تفصیلات، تفصیلات۔

اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ کسی نے ورلڈ بینک کو کسی منصوبے سے ہاتھ کھینچنے پر مجبور کر دیا ہو۔ اور وہ بھی دنیا کے ایک غریب ترین ملک کے غریب ترین لوگوں پر مشتمل غیر مسلح فوج نے۔ ان

لوگوں نے جن سے ملاقات کے لیے بینک کا اُس وقت کا صدر لوئس پریسٹن اپنے بھارت کے دوروں میں شدید مصروفیات کے باعث وقت نہ نکال سکا تھا۔ بینک کو پسپا ہونے پر مجبور کرنا وادی کے باسیوں کی بہت بڑی اخلاقی فتح تھی اور ہے۔

لیکن مسرت کا یہ ماحول زیادہ عرصے قائم نہ رہ سکا۔ گجرات سرکار نے اعلان کیا کہ وہ دو کروڑ ڈالر کی کمی اپنے وسائل سے پوری کرے گی اور منصوبے کو جاری رکھے گی۔ آزادانہ جائزے کے دوران اور اس کی رپورٹ کی اشاعت کے بعد بھی وادی میں لوگوں اور سرکار کے درمیان محاذ آرائی جاری رہی تھی — تذلیل، گرفتاری، لاٹھی چارج، غیر معینہ مدت کی بھوک ہڑتالیں جو عارضی وعدوں اور مستقل وعدہ خلافیوں سے ختم کرائی جاتیں۔ جو لوگ اپنے مکان چھوڑ کر بحالی مرکزوں میں منتقل ہونے پر رضامند ہو گئے تھے اپنے گاؤوں کو واپس لوٹنے لگے۔ مہاراشٹر کے گاؤں منی بیلی میں، جو مزاحمتی تحریک کا اعصابی مرکز ہے، سینکڑوں دیہاتیوں نے مون سون کے ستیہ گرہ میں حصہ لیا۔ 1993 میں جب پانی چھوڑا گیا تو منی بیلی کے خاندان اپنے مکانوں میں جمے رہے۔ وہ اپنے بچوں کو بازوؤں میں تھامے پیڑوں کے تنوں سے چپٹے رہے اور اپنی جگہ چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ آخرکار پولیس والوں نے انھیں کھینچ کر نیچے اتارا اور گھسیٹ کر وہاں سے لے گئے۔ این بی اے نے اعلان کیا کہ اگر سرکار نے منصوبے پر نظر ثانی نہ کی تو 16 اگست 1993 کو کارکنوں کا ایک دستہ ذخیرے کے ابھرتے ہوئے پانی میں کود کر جان دے دے گا۔ 5 اگست کو سرکار نے سردار سروور منصوبے کا جائزہ لینے کے لیے ایک اَور کمیٹی قائم کر دی جسے 'فائیو ممبر گروپ' (FMG) کا نام دیا گیا۔

گجرات سرکار نے کمیٹی کو ریاست میں داخل ہونے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ ایف ایم جی کی رپورٹ ('ڈیسک پر تیار کی گئی رپورٹ') اگلے سال داخل کی گئی۔ اس نے بھی دبے لفظوں میں آزادانہ جائزے کے نتائج کی تصدیق کی۔ لیکن اس سے بھی کوئی فرق نہ پڑا۔ کچھ بھی نہ بدلا۔ یہ بھی ریاست کا ایک آزمودہ نسخہ ہے: وہ آپ کو کمیٹیوں کے ذریعے ہلاک کر ڈالتی ہے۔

❁

فروری 1994 میں گجرات سرکار نے ڈیم کے آبی پھاٹکوں کو مستقل طور پر بند کرنے کا اعلان کیا۔ مئی 1994 میں این بی اے نے سپریم کورٹ میں ایک رٹ پٹیشن دائر کردی جس میں سردار سرو ور منصوبے کی پوری بنیاد کو چیلنج کیا گیا تھا اور اس کی تعمیر روکنے کی درخواست کی گئی تھی۔

اس سال مون سون میں جب ذخیرے میں پانی کی سطح بلند ہوئی اور پانی ڈیم کے دوسری طرف پہنچا تو اس کا ریلا ایک سٹلنگ بیسن سے 65 ہزار مکعب میٹر کنکریٹ اور 35 ہزار مکعب میٹر چٹان کو اپنے ساتھ بہا لے گیا جس نے 65 میٹر قطر کا گڑھا پڑ گیا۔ ندی کی زمین پر بنایا گیا بجلی گھر سیلاب کی زد میں آ گیا۔ نقصان کو کئی ماہ تک چھپایا جاتا رہا۔ اس کے بارے میں اخباری رپورٹیں جنوری 1995 میں شائع ہونی شروع ہوئیں۔

1995 کے اوائل میں سپریم کورٹ نے، اس بنیاد پر کہ بے دخل ہونے والوں کی بحالی کا انتظام مناسب طور سے نہیں کیا گیا، منصوبے پر تعمیراتی کام کو اگلے احکامات تک کے لیے روکنے کا حکم جاری کیا۔ اس وقت ڈیم کی اونچائی اوسط سطح سمندر سے 80 فٹ تک پہنچ چکی تھی۔

اس اثنا میں مدھیہ پردیش کے دو اور ڈیموں پر کام شروع ہو چکا تھا: ایک نرمدا ساگر ڈیم جس کے بغیر سردار سرو ور اپنی 17 سے 30 فیصد کارکردگی کھو بیٹھتا ہے، اور دوسرا مہیشور ڈیم۔ مہیشور ڈیم کا مقام ندی کے بہاؤ کی سمت سردار سرو ور کے فوراً بعد واقع ہے۔ مدھیہ پردیش سرکار نے ایک پرائیویٹ کمپنی ––– بھارت کے ایک نمایاں ترین ٹیکسٹائل میگنیٹ ایس کمار ––– سے بجلی خریدنے کا معاہدہ بھی کرلیا۔

سردار سرو ور کے علاقے میں تناؤ عارضی طور پر کم ہو گیا اور لڑائی کا مقام ندی کے بہاؤ پر اوپر کی طرف نیماڑ کے زرخیز میدانی علاقے مہیشور میں منتقل ہو گیا۔

سپریم کورٹ میں زیرِ سماعت مقدمے کی بدولت وادی میں جابرانہ اقدامات میں قابلِ احساس کمی آئی۔ ڈیم پر تعمیراتی کام رک چکا تھا، لیکن بے دخل ہونے والوں کی بحالی کا ناٹک جاری رہا۔ جنگل، جو زیرِ آب آنے کے لیے نشان زد کر لیے گئے تھے، بدستور کاٹے جاتے رہے اور ان کی لکڑی ٹرکوں میں لاد کر لے جائی جاتی رہی، جس کے نتیجے میں ان جنگلوں پر انحصار کرنے والے لوگ روزی کی تلاش میں علاقہ چھوڑنے پر مجبور ہوتے رہے۔

اگرچہ ڈیم ابھی اپنی مجوزہ اونچائی کے آس پاس بھی نہیں پہنچا ہے لیکن علاقے کے ماحول اور

وہاں بسنے والے لوگوں پر اس کے سنگین اثرات ابھی سے محسوس ہونے لگے ہیں۔ ڈیم کے مقام اور اس کے اردگرد کے دیہات میں ملیریا کے مریضوں کی تعداد چھ گنا ہو گئی ہے۔ سردار سرودر ڈیم پر ندی کے بہاؤ کی مخالف سمت میں کئی کلومیٹر دور تک ریت بڑی مقدار میں جمع ہو گئی ہے؛ اس کی گہرائی کمر تک اور پھیلاؤ دو سو میٹر سے زیادہ ہے اور اس کے باعث ندی تک پہنچنے کا راستہ کٹ گیا ہے۔ پانی کے گھڑے اٹھائے عورتوں کو اب کئی کلومیٹر —— سچ مچ کئی کلومیٹر —— کا چکر لگا کر کسی ایسے مقام تک پہنچنا پڑتا ہے جہاں وہ ندی سے پانی لے سکیں۔ گائیں اور بکریاں ریت کی اس دلدل میں پھنس کر ہلاک ہو جاتی ہیں۔ بہاؤ کی سمت آگے بنائی گئی مصنوعی رکاوٹ سے پیدا ہونے والے غیر فطری بھنور کے باعث لکڑی کے ایک لٹھے سے بنائی ہوئی قبائیلوں کی روایتی چھوٹی کشتیاں اب غیر محفوظ ہو گئی ہیں۔

بہاؤ سے اُور اوپر کی جانب، جہاں ریت کے جمع ہونے کا مسئلہ ابھی گمبھیر نہیں ہوا ہے، ایک اَور مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ بے زمین لوگ (جن میں بیشتر آدی واسی اور دلت ہیں) خشک سالی کے مہینوں میں ندی کے پیچھے ہٹنے سے نکلنے والی اُتھلی ریتیلی زمین کے ریجوں پر روایتی طور پر چاول، پھل اور سبزیاں اگاتے آئے ہیں۔ ہر کچھ دن بعد باگڑی ڈیم پر (جو ندی پر اَور پیچھے کی طرف جبل پور کے قریب واقع ہے) تعینات انجینئر ندی کی سطح اونچی ہونے پر اچانک پانی چھوڑ دیتے ہیں جس کی وجہ سے سینکڑوں خاندانوں کی فصلیں کئی بار بہہ گئیں اور ان کے پاس روزی کا کوئی ذریعہ نہ رہا۔ اچانک انھیں محسوس ہونے لگا ہے کہ اب وہ اپنی ندی پر بھروسا نہیں کر سکتے۔ یہ بالکل ایسا ہے جیسے اپنے کسی پیارے میں ذہنی مرض کی علامات پیدا ہو جائیں۔ کوئی بھی شخص جس نے ندی سے پیار کیا ہو آپ کو بتا سکتا ہے کہ اپنی ندی سے محروم ہو جانا کیسی ہولناک، دردانگیز بات ہے۔ لیکن اگر میں نے اپنا یہ جذباتی لہجہ برقرار رکھا تو مجھے ڈانٹ ڈپٹ کا سامنا کرنا پڑے گا۔ جہاں عظیم تر اجتماعی مفاد کا معاملہ زیرِ بحث ہو وہاں جذبات کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ صرف حقائق تک محدود رہنا پڑتا ہے۔ معاف کیجیے، میرا دل بہک گیا تھا۔

بے گھر ہونے والے لوگوں سے سلوک کے معاملے میں مدھیہ پردیش اور مہاراشٹر کی سرکاریں اپنے متکبرانہ رویے پر قائم ہیں۔ بحالی کے سلسلے میں گجرات سرکار کی پالیسی (جو صرف کاغذ پر موجود ہے) ایسی عالیشان ہے کہ اس کے مقابلے میں باقی دونوں ریاستیں قرونِ وسطیٰ کی یادگار معلوم ہونے لگتی

ہیں۔ اس کا دعویٰ ہے کہ یہ دنیا کا بہترین بحالی کا پیکیج ہے۔ اس میں مہاراشٹر اور مدھیہ پردیش کے بے گھر ہونے والے لوگوں کو بھی زمین کے بدلے زمین دینے کی پیشکش کی گئی ہے، اور 'تجاوزات قائم کرنے والوں' تک کے (جو عموماً ایسے آدی واسی ہوتے ہیں جن کے پاس زمین کی ملکیت کا کاغذی ثبوت نہیں ہوتا) دعووں کو تسلیم کیا گیا ہے۔ لیکن اس پالیسی کا اصل فریب اس بات میں مضمر ہے کہ 'منصوبے کے متاثرین' کی تعریف کس طرح متعین کی گئی ہے۔

جہاں تک حقائق کا سوال ہے تو کل 226 دیہات میں سے مدھیہ پردیش اور مہاراشٹر کے علاقے میں پڑنے والے گاؤوں کی بات تو جانے دیجیے، گجرات سرکار اب تک اپنی ریاست کے ان 19 گاؤوں کے بے گھر لوگوں کی بحالی کا کام نہیں کر سکی ہے جنھیں زیرآب آنے کے لیے چنا گیا ہے۔ ان 19 گاؤوں کے باسیوں کو 175 مختلف بحالی مرکزوں میں منتشر کر دیا گیا ہے۔ سماجی رشتے پارہ پارہ ہو گئے ہیں، برادریاں ٹوٹ پھوٹ گئی ہیں۔

عملی طور پر، بحالی اور بازآبادکاری کی کہانی (چند 'مثالی گاؤوں' کو چھوڑ کر) بے حسی اور وعدہ خلافی کی کہانی ہے۔ چند لوگوں کو زمین دی گئی، باقیوں کو نہیں دی گئی۔ کچھ لوگوں کو پتھریلی اور ناقابلِ کاشت زمین ملی۔ کچھ کی زمین قابلِ علاج تھور کی شکار ہے۔ کچھ کو زمین کے مالکوں نے بھگا دیا جنھوں نے سرکار کے ہاتھ زمین بیچی تھی لیکن سرکار نے انھیں اب تک ادائیگی نہیں کی۔

کچھ لوگ جنھیں دوسرے گاؤوں کی سرحدوں پر بسایا گیا تھا، انھیں ان گاؤں والوں نے لوٹا، مارا پیٹا اور ان کی جگہوں سے ہٹا دیا۔ کئی صورتوں میں ایسا ہوا کہ دو مختلف ڈیموں کے باعث بے دخل ہونے والوں کو متصل زمینوں پر بسایا گیا۔ کم از کم ایک مثال ایسی ہے کہ تین مختلف ڈیموں — اُکائی، سردار سرودر اور کرجن ڈیم — کے علاقوں سے بے دخل ہونے والوں کو ایک ہی علاقے میں بسا دیا گیا۔ پانی، مویشیوں کے چرنے کے میدان اور روزگار جیسے بنیادی وسائل کے لیے آپس میں لڑنے کے علاوہ انھیں ان بے زمین کھیت مزدوروں سے بھی مقابلہ کرنا پڑا جو اُن غیر حاضر زمینداروں کی زمین

کاشت کرتے تھے جنھوں نے یہ زمین سرکار کے ہاتھ فروخت کردی۔

بے گھر ہونے والوں کی ایک اَور بھی قسم ہے، یعنی وہ لوگ جن کی زمین سرکار نے زبردستی چھین لی تاکہ اس پرڈیموں کے باعث بے دخل ہونے والوں کی بحالی کے مراکز قائم کیے جائیں۔ ان بدنصیب لوگوں کے درمیان بھی درجوں کی تفریق موجود ہے: سردار سرور ڈیم کے باعث بے دخل ہونے والے باقی بے گھروں کی بہ نسبت زیادہ ممتاز ہیں کیونکہ ان کے بارے میں اخباروں میں کبھی کبھار خبریں چھپتی رہتی ہیں اور ان کا مقدمہ بھی زیرِ سماعت ہے۔ (دوسرے ترقیاتی منصوبوں کے سلسلے میں، جہاں نہ کوئی اخبار ہے نہ این بی اے، نہ عدالتی مقدمہ، کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے۔ وہاں سے بے دخل ہونے والے اپنا نشان چھوڑے بغیر غائب ہو جاتے ہیں۔)

بحالی کے بہت سے مرکزوں میں لوگوں کو ٹین کی چادروں سے قطار میں بنے شیڈوں میں ڈال دیا گیا ہے جو گرمیوں میں تندور اور جاڑوں میں برف خانہ بن جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض ندی کی سوکھی زمین پر واقع ہیں جو مون سون میں پانی کے تیز رفتار ریلے میں بدل جاتی ہے۔ میں ایسے کئی مراکز میں جا چکی ہوں۔ باقی مراکز کی میں نے فلمیں دیکھی ہیں: کپکپاتے ہوئے بچے پرندوں کی طرح چارپائیوں کے کوندوں پر دبکے بیٹھے ہیں اور پانی کے ریلے ان کے ٹین کے مکانوں میں داخل ہو رہے ہیں۔ خوفزدہ پھٹی ہوئی آنکھیں اپنے برتنوں کو پانی کے ساتھ بہہ کر دروازے سے باہر جاتا دیکھتی ہیں جبکہ ان کے سوکھے بدن والے باپ ان برتنوں کے پیچھے دوڑ کر انھیں بچالانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

جب پانی اترتا ہے تو اپنے پیچھے تباہی چھوڑ جاتا ہے۔ ملیریا، اسہال، کیچڑ میں پھنسے ہوئے بیمار مویشی۔ اپنے پچھلے تباہ شدہ مکانوں میں سے بچائے ہوئے ساگوان کی لکڑی کے قدیم شہتیر جو انھوں نے اپنے کسی اگلے مکان میں لگانے کے لیے کسی ملتوی شدہ خواب کی طرح احتیاط سے سینت رکھے تھے، اب پانی میں ڈوبے رہنے سے سڑ کر ناقابلِ استعمال ہو گئے ہیں۔

مہاراشٹر میں مئی ندی سے بے دخل ہونے والے چالیس خاندانوں کو ایک بحالی مرکز میں بسایا گیا۔ پہلے سال ان خاندانوں میں 38 بچے مرے۔

آج (26 اپریل 1999) کے اخبار انڈین ایکسپریس میں گجرات کے ایک بحالی مرکز میں ہونے والی نو اموات کی رپورٹ چھپی ہے۔ یہ سب لوگ ایک ہفتے کے اندر اندر مرے۔ اگر آپ کو

اس حساب سے دلچسپی ہو تو یہ شرح 2875.1 متاثر افراد یومیہ بنتی ہے۔

بہت سے لوگ جنھیں ان بحالی مرکزوں میں بسایا گیا ہے، ایسے ہیں کہ انھوں نے اپنی پوری زندگی گھنے جنگلوں میں رہ کر گزاری ہے جہاں ان کا نقدی سے یا جدید دنیا سے کبھی سابقہ نہ پڑا۔ اچانک وہ خود کو اس نئی صورتحال میں پاتے ہیں کہ ان کے پاس دو ہی راستے ہیں: یا تو بھوکے مر جائیں یا کئی کلومیٹر پیدل چل کر نزدیک کے شہر یا قصبے تک پہنچیں اور سڑک کے کنارے قطار میں بیٹھ کر (مرد اور عورتیں دونوں) دیہاڑی پر کام کرنے کے لیے خود کو قابل فروخت اشیا کی طرح پیش کریں۔

خود انحصاری اور آزادی کی حالت سے نکل کر مفلسی اور اس دنیا کی محتاجی کی حالت میں پہنچنا جس کے بارے میں وہ کچھ بھی نہیں جانتے — آپ کے خیال میں ان کو کیسا محسوس ہوتا ہوگا؟ کیا آپ خود گوا میں اپنے بیچ ہاؤس کے بدلے میں پہاڑ گنج کی ایک کھولی لینا پسند کریں گے؟ کیا قوم کی خاطر بھی نہیں؟

سچ بات یہ ہے کہ ریاستی انتظامیہ کے لیے، کسی بھی ریاستی انتظامیہ کے لیے، یہ ممکن ہی نہیں کہ اتنے بڑے پیمانے پر ایسے لوگوں کی بحالی کا کام کر سکے جن کی زندگیوں کا توازن اس قدر نازک اور مخدوش ہو۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے باغ کے گرد لگی باڑھ کو کاٹنے والی بڑی قینچی سے شیر خوار بچے کی انگلیوں کے ناخن تراشنے کی کوشش کی جائے۔ یہ کام کرنے میں اس کی انگلیاں کٹ جائیں گی۔ زمین کے بدلے زمین کی پیشکش ایک معقول معاوضہ معلوم ہوتی ہے، لیکن اس پر عمل درآمد کیسے ہوگا؟ آخر وہ کون سا طریقہ ہے جس کے ذریعے دو لاکھ افراد کو (یہ سرکاری تخمینہ ہے، اپنے تمام نقائص سمیت)، جن میں سے ایک لاکھ سترہ ہزار آدی واسی قبائلی ہیں، ان کی جگہوں سے اکھاڑ کر انسانی طریقے سے دوسری جگہ بسایا جا سکے؟ ان کی برادریاں اکٹھی کیونکر رکھی جائیں گی جبکہ اس ملک میں زمین کے ایک ایک چپے پر لڑائیاں ہوتی ہیں اور جبکہ یہاں کی عدالتوں میں زیر سماعت تقریباً تمام مقدمات زمین کی ملکیت کے قبضے پر ہیں؟

آخر وہ تمام عمدہ، غیر مقبوضہ، قابل کاشت زمین کہاں واقع ہے جو ان اکٹھی برادریوں کے سپرد کیے جانے کا انتظار کر رہی ہے؟

اس سوال کا سیدھا جواب یہ ہے کہ کہیں بھی نہیں۔ اس زمین کا کہیں وجود نہیں، صرف ایک ڈیم

کے باعث بے دخل ہونے والوں لوگوں کی سرکاری تعداد کے لیے بھی نہیں۔

اور اس کے علاوہ باقی جو تین ہزار دو سو ننانوے (3299) ڈیم ہیں ان کے متاثرین کا کیا بنے گا؟ ان تمام PAPs کا کیا ہوگا جنھیں نیست و نابود کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا ہے؟ کیا ہم ان کے دروازوں پر ستارۂ داؤد لگا دیں اور اس قصے کو ختم کر دیں؟

مدھیہ پردیش کے نیاڑ میدانی علاقے کا مقام جالوڑ، ان ساٹھ گاؤں میں پہلا ہے جو مہیشور ڈیم کے ذخیرۂ آب کی زد میں آئیں گے۔ جالوڑ آدی واسیوں کا گاؤں نہیں ہے، اس لیے اس میں ذات پات کی وہ پوری شرمناک تقسیم موجود ہے جو ہر ہندو گاؤں کی نحوست ہے۔ زمیندار کسانوں کی اکثریت (یعنی وہ لوگ جو PAP کہلانے کے قانونی طور پر حقدار ہیں) راجپوت ہے۔ ان کی زیرِ کاشت زمین بھارت کی زرخیز ترین زمینوں میں سے ہے۔ ان کے گھر گیہوں، دال اور چاول کی بوریوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی زمین پر اُگنے والی چیزوں کا اتنا بکھان کرتے ہیں کہ اگر یہ معاملہ اس قدر المناک نہ ہوتا تو ان کی یہ گفتگو آپ کے اعصاب پر بوجھ بن جاتی۔ ڈیم کی تعمیر کے مقام پر کیے جانے والے ڈائنامائٹ کے دھماکوں سے ان کے مکانوں کی دیواروں میں ابھی سے شگاف پڑ گئے ہیں۔ ڈیم کے مقام کے بالکل قریب آباد بارہ خاندانوں سے (جو تقریباً سب کے سب دلت ہیں) ان کی ملکیت کے زمین کے چھوٹے چھوٹے قطعے چھینے جا چکے ہیں۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ جب انھوں نے اس پر احتجاج کیا تو کس طرح ان کے پانی کے پائپوں کو سیمنٹ سے بھر دیا گیا، ان کی کھڑی فصلوں پر بل ڈوزر چلا دیے گئے اور پولیس نے جبراً ان کی زمین پر قبضہ کرلیا۔ یہ بارہ کے بارہ خاندان اب بے زمین ہیں اور دیہاڑی پر مزدوری کرتے ہیں۔

جالوڑ کے باسیوں کو ان کی جگہ سے ہٹا کر جہاں لے جایا جائے گا وہ جگہ ندی کی مخالف سمت میں اندر کی جانب کئی کلومیٹر کے فاصلے پر سمراج نامی گاؤں کے پاس واقع ہے جس میں زیادہ تر آدی واسی اور دلت آباد ہیں۔ میں نے وہ وسیع قطعۂ زمین دیکھا ہے جو اِن بے دخل ہونے والوں کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ یہ ایک سخت پتھریلی پہاڑی تھی جس پر کہیں کہیں گھاس اور جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ اس پتھریلی سطح پر ٹرکوں میں لاد لاد کر ندی سے نکالی ہوئی مٹی کی تہہ بچھائی گئی تا کہ اس کے زرخیز، سیاہ، کپاس کی کاشت کے لیے سازگار زمین ہونے کا تاثر دیا جاسکے۔ یہ قصہ کچھ یوں ہے: ایس

کمار اینڈ کمپنی (ٹیکسٹائل کے وہی مالدار تاجر جنھوں نے اب قومی تعمیر کا ٹھیکہ لے لیا ہے) کے نمائندے کے طور پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اس زمین کا قبضہ لیا جو دراصل گاؤں کے سب لوگوں کی مشترکہ چراگاہ تھی اور پورے سمراج گاؤں کی ملکیت سمجھی جاتی تھی۔ اس زمین کے علاوہ گاؤں کے دس دلت باشندوں کی زمین بھی قبضے میں لے لی گئی۔ اس کا کوئی معاوضہ ادا نہیں کیا گیا۔

گاؤں والے جن کی آمدنی کا بڑا ذریعہ ان کے پالتو مویشی تھے، انھیں اپنی بھینسیں اور بکریاں بیچنے پر مجبور ہونا پڑا کیونکہ ان کے پاس انھیں چرانے کے لیے کوئی جگہ نہیں رہی تھی۔ اس کے بعد ان کی روزی کا واحد ذریعہ گاؤں کے باہر کی چھوٹی سی جھیل کا کنارہ ہے (تھا)۔ گرمیوں میں جب پانی کی سطح نیچی ہوتی ہے تو جھیل کے گرد زرخیز مٹی کا دائرہ رہ جاتا ہے (تھا) جہاں یہ لوگ چاول، خربوزے اور لکڑیاں اگاتے ہیں (تھے)۔

ایس کمار اینڈ کمپنی نے بے دخل ہونے والوں کو دی جانے والی بنجر زمین کو (جسے لینے پر جالوڑ کے راجپوت کسان قطعی تیار نہیں ہیں) مصنوعی طور پر سجانے کے لیے یہی جھیل کنارے کی زرخیز مٹی کھود لی۔ جھیل کے کنارے پر اب گہرے گڑھے پڑ گئے ہیں اور وہ کاشت کے قابل نہیں رہا۔

سمراج گاؤں کے لوگ، جو پہلے ہی بے حد مفلس تھے، اب فاقہ کشی پر مجبور کر دیے گئے ہیں جبکہ پہاڑی کو اُس وقت تصویریں کھنچوانے کے لیے تیار کر دیا گیا ہے جب جرمن امداد دینے والے، یا بھارتی جج یا کوئی اور فکرمند شخص یہاں سے گزرے گا۔

بھارت میں کام اسی طرح چلتا ہے۔ یہ مہیشور ڈیم کی شروعات ہے۔ پہلے گاؤں کی کہانی۔ باقی انسٹھ گاؤوں میں کیا ہوگا؟ کاش اس ڈیم پر نحوست کا سایہ ہو! کاش نیکسال ٹائیکون پر بل ڈوزر چڑھ جائے!

اس قسم کے طرزِ عمل کو کسی بھی طرح جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اس قسم کے حالات میں بے دخل ہونے والوں کی بحالی کے بارے میں بحث شروع کرنا بھی دراصل انصاف کے اصولوں کو بالائے طاق رکھنے کی شروعات کرنا ہے۔ چار کروڑ لوگوں تک پانی پہنچانے (یا پانی پہنچانے کا ناٹک کرنے) کے لیے دو لاکھ لوگوں کو ان کی جگہ سے اکھاڑ کر دوسری جگہ لے جانا —— اس عمل کے پیمانے میں کہیں کوئی بہت بڑی گڑبڑ ہے۔ یہ فاشزم کا حساب کتاب ہے۔ یہ

کہانیوں کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ اور اچھے خاصے معقول لوگوں کو اپنے چمکدار جعلی وژن سے اندھا کر دیتا ہے۔

❁

جب مارچ (1999) کے آخر میں مَیں نرمدا ندی کے کنارے پہنچی تو سپریم کورٹ کو سردار سروور ڈیم کی تعمیر پر لگائے گئے حکم امتناعی کو ختم کیے ایک مہینہ گزر رہا تھا۔ میں اس موضوع پر ہر وہ چیز پڑھ چکی تھی جو میرے ہاتھ لگ سکی (جن میں وہ تمام سرکاری دستاویزات بھی شامل تھیں جن پر 'خفیہ' کا لیبل لگا ہوتا ہے۔) مجھے واقعات اور ان کے محل وقوع کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا۔ پوری کہانی میری آنکھوں کے سامنے ایک المیہ فلم کی طرح چل رہی تھی جس کے کرداروں سے میں مل چکی تھی۔ اگر مجھے اس قصے کی پوری تاریخ معلوم نہ ہوتی تو کسی چیز کا کچھ مطلب سمجھ میں نہ آتا۔ کیونکہ وادی میں کہانیوں کے اندر کہانیاں ہیں اور دوسرے لوگوں کے دکھوں کی دلدل میں دھنس کر اپنے طیش کی راستی کو کھو بیٹھنا بہت آسان ہے۔

میں نے اپنا سفر کیوڑیا کالونی میں ختم کیا جہاں سے اس پورے قصے کا آغاز ہوا تھا۔ اڑتیس برس پہلے گجرات سرکار نے اسی مقام پر وہ بنیادی ڈھانچہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا تھا جو ڈیم کی تعمیر کا کام شروع کرنے کے لیے درکار تھا: گیسٹ ہاؤس، آفس بلاک، انجینئر اور ان کے عملے کے رہنے کے لیے مکان، ڈیم کی تعمیر کے مقام تک لے جانے والی سڑکیں، تعمیراتی سامان ذخیرہ کرنے کے گودام۔

یہ کالونی اس جگہ کے اوپری سرے پر واقع ہے جہاں اب سردار سروور ڈیم کا ذخیرۂ آب اور وہ طلسمی نہر ہے جسے گجرات کی شہ رگ کہا جاتا ہے اور جو کروڑوں لوگوں کی پیاس بجھانے والی ہے۔

یہ بات کوئی نہیں جانتا کہ کیوڑیا کالونی اس دنیا کی کنجی ہے۔ وہاں جائیے، آپ پر سارے راز منکشف ہو جائیں گے۔

1961 کے موسم سرما میں، گوٹھی نامی گاؤں میں ایک سرکاری افسر آیا اور اس نے گاؤں والوں کو مطلع کیا کہ ان کی کچھ زمین ایک ہیلی پیڈ تعمیر کرنے کے لیے درکار ہے۔ چند روز بعد ایک بل ڈوزر

نمودار ہوا جس نے کھڑی فصل کو روند کر زمین کو ہموار کر دیا۔ گاؤں والوں سے کچھ کاغذوں پر دستخط کرائے گئے اور انھیں کچھ رقم دی گئی جس کو انھوں نے اپنی کھڑی فصلوں کی بربادی کا معاوضہ سمجھا۔ جب ہیلی پیڈ بن کر تیار ہو گیا تو اس پر ایک ہیلی کاپٹر آ کر اترا اور اس میں سے وزیر اعظم نہرو برآمد ہوا۔ بیشتر گاؤں والے نہرو کو نہ دیکھ سکے کیونکہ اس کے گرد پولیس والوں کا گھیرا تھا۔ نہرو نے وہاں ایک تقریر کی۔ اس کے بعد اس نے ایک بٹن دبایا جس سے ندی کے دوسری طرف ایک زوردار دھماکا ہوا۔ دھماکے کے بعد وہ رخصت ہو گیا۔ یہ سردار سرودر ڈیم کی بالکل ابتدائی شکل کا افتتاح تھا:

کیا نہرو کو وہ بٹن دباتے وقت معلوم تھا کہ اس سے ایک بھیانک خواب کا آغاز ہو رہا ہے؟

نہرو کے جانے کے بعد گجرات سرکار اپنی پوری طاقت کے ساتھ آ پہنچی۔ اس نے چھ گاؤوں کے 950 خاندانوں کی سولہ سو ایکڑ زمین اپنے قبضے میں لے لی۔ یہ لوگ تاڑوی آدی واسی تھے، لیکن بڑودہ شہر کے قریب رہنے کی وجہ سے منڈی کی معیشت کے طور طریقوں سے اتنے زیادہ بے خبر نہ تھے۔ انھیں نوٹس بھیجے گئے اور اطلاع دی گئی کہ انھیں نقد معاوضہ اور ڈیم کی تعمیر کے مقام پر روزگار دیا جائے گا۔ تب یہ ڈراؤنا خواب شروع ہوا۔ ٹرک اور بل ڈوزر آ پہنچے۔ جنگل کاٹ ڈالے گئے، کھڑی فصلیں روند ڈالی گئیں۔ سب کچھ جیپوں، انجینئروں، سیمنٹ اور فولاد کے ایک گھومتے ہوے چکر میں بدل گیا۔ موہن بھائی تاڑوی نے آٹھ ایکڑ پر کھڑی اپنی جوار، تُور [ارہر] اور کپاس کی فصلوں کو زمین کے برابر ہوتے دیکھا۔ وہ راتوں رات ایک بے زمین مزدور بن گیا۔ تین سال بعد اسے تین قسطوں میں نقد معاوضے کی ادائیگی کی گئی: ڈھائی سو روپے فی ایکڑ کے حساب سے۔

درسکھ بھائی دیسا بھائی کے باپ کو اس کے مکان اور پانچ ایکڑ زمین کا معاوضہ ساڑھے تین ہزار روپے دیا گیا (اس میں اس زمین پر کھڑی فصلوں اور تمام پیڑوں کا معاوضہ بھی شامل ہے۔) اسے یاد ہے کہ کس طرح وہ اپنے باپ کی انگلی تھامے ضلع ہیڈکوارٹر راج پیپلا تک پیدل جایا کرتا تھا۔ اسے یہ بھی یاد ہے کہ جب کبھی ان لوگوں کو تحصیلدار کے دفتر میں طلب کیا جاتا تو ان پر کیسی دہشت طاری ہو جاتی تھی۔ انھیں معاوضے کے سلسلے میں جاری کیے گئے تمام نوٹس واپس جمع کرانے اور ایک رسید پر دستخط کرنے کا حکم دیا گیا۔ وہ پڑھنا لکھنا نہیں جانتے اس لیے ان کو کچھ نہیں معلوم کہ رسید پر کتنی رقم لکھی ہوئی تھی۔ ان میں سے ہر شخص کو راج پیپلا جانا پڑتا، لیکن ہر ایک کو الگ الگ دن اکیلے طلب کیا جاتا۔ اس

لیے وہ ایک دوسرے سے صلاح مشورہ یا رقموں کا موازنہ بھی نہیں کر سکے۔

رفتہ رفتہ، ڈھول اور بلڈوزروں کے درمیان سے ایک جارحانہ، دور تک پھیلی ہوئی تعمیر ابھری۔ یہ کیوڑیا کالونی تھی۔ سیمنٹ کے بدصورت فلیٹوں، دفتروں، مہمان خانوں اور سڑکوں کی قطاریں۔ بڑے ڈیموں کی تعمیر کے لیے بنایا جانے والا پورا بے وقار ڈھانچہ۔ گاؤں والوں کے مکان ڈھا دیے گئے اور انھیں کالونی کے کنارے پر منتقل کر دیا گیا، جہاں وہ اب تک پڑے ہیں، اپنی ہی زمین پر ایک کچی آبادی کی صورت میں۔ ان میں سے جن لوگوں نے گڑبڑ کرنے کی کوشش کی انھیں پولیس اور کنسٹرکشن کمپنی نے ڈرا دھمکا کر خاموش کر دیا۔ گاؤں والوں نے مجھے بتایا کہ ٹھیکے دار کے ہیڈکوارٹر میں ایک 'حوالات' ہے جہاں اڑیل لوگوں کو بند کر کے پیٹا جاتا ہے۔

جو لوگ کیوڑیا کالونی کی تعمیر کے سلسلے میں بے دخل کیے گئے وہ گجرات سرکار کے بنائے ہوئے 'بحالی کے پیکیج' کی رو سے منصوبے سے متاثر ہونے والوں (PAPs) کی فہرست میں شامل کیے جانے کے حقدار نہیں ہیں۔

ان گاؤں والوں میں کچھ لوگ افسروں کے بنگلوں اور گیسٹ ہاؤسوں میں نوکروں اور ویٹروں کے طور پر کام کرتے ہیں جو اس زمین پر تعمیر کیے گئے ہیں جہاں کبھی ان کے اپنے مکان قائم تھے۔ کیا کوئی چیز اس سے زیادہ تکلیف دہ ہو سکتی ہے؟

جن لوگوں کے پاس تھوڑی بہت زمین باقی رہ گئی تھی انھوں نے اس پر کاشت کرنے کی کوشش کی، لیکن کیوڑیا میونسپلٹی نے ایک سکیم شروع کی جس کے تحت سڑکوں پر پڑے ہوئے کوڑے کرکٹ کو کھا کر ختم کرنے کے لیے سؤر لائے گئے۔ یہ سؤر گاؤں والوں کے کھیتوں میں گھومتے پھرتے اور ان کی فصلوں کو برباد کر ڈالتے ہیں۔

1992 میں، یعنی تیس برس بعد، ہر اس خاندان کو جو اپنا گھر چھوڑ کر چلے جانے پر آمادہ ہو، بارہ ہزار روپے فی ہیکٹیر معاوضے کی پیشکش کی گئی، بشرطے کہ کل رقم 36 ہزار روپے سے تجاوز نہ کرے! اس کے باوجود جتنی زمین پر قبضہ کیا گیا تھا اس میں سے 40 فیصد اب تک غیر استعمال شدہ پڑی ہے۔ سرکار اسے واپس کرنے سے انکار کرتی ہے۔ دیوی بین سے، جو اب بیوہ ہو چکی ہے، لی گئی زمین سوامی نارائن ٹرسٹ نامی ایک بڑے مذہبی ادارے کو دے دی گئی۔ اس کے ایک چھوٹے سے گوشے میں ٹرسٹ کے

زیرِ اہتمام ایک سکول چلایا جاتا ہے۔ باقی پر کاشت کی جاتی ہے، جسے دیوی بین کانٹے دار باڑھ میں سے جھانک کر دیکھ سکتی ہے۔ گورا گاؤں سے ہتھیائی ہوئی دو سو ایکڑ زمین سے گاؤں والوں کو بے دخل کر کے فلیٹوں کے بلاک تعمیر کیے گئے۔ یہ فلیٹ برسوں تک خالی پڑے رہے۔ آخر کار سرکار نے انھیں نہایت سستے نرخ پر ڈیم کی تعمیر کے ٹھیکے دار جے پرکاش ایسوسی ایٹس کو کرائے پر دے دیا، جنھوں نے، گاؤں والوں کے مطابق، انھیں 32 ہزار روپے مہینہ کرائے پر کسی اور کو دے دیا۔ (جے پرکاش ایسوسی ایٹس، ملک کے ڈیم سازی کے سب سے بڑے ٹھیکے دار، قومی تعمیر کرنے والے، وہی لوگ ہیں جو ہیں جو دہلی میں سدھارتھ کانٹی نینٹل اور وسنت کانٹی نینٹل کے مالک ہیں۔)

130 ایکڑ کے رقبے پر پی ڈبلیو ڈی نے قدیم شولپنیشور مندر کی، جو آبی ذخیرے میں ڈوب گیا تھا، ایک لغو نقل سیمنٹ سے تعمیر کی ہے۔ جس سیاسی گروہ نے پوری قوم کو ایک خونی دقیانوسی کابوس میں محض اس بنا پر مبتلا کر دیا تھا کہ وہ ایک مسجد کو ڈھا کر ایک ایسا قدیم مندر دوبارہ تعمیر کرنا چاہتا تھا جس کا حقیقت میں کبھی کوئی وجود نہیں رہا تھا، وہی گروہ ایک یاترا کے ایک مقدس راستے اور سینکڑوں مندروں کو جن میں لوگ صدیوں سے پوجا کرتے چلے آئے تھے، ڈیم کی تعمیر پر قربان کرنے کو کوئی بڑی بات نہیں گردانتا۔ وہ ایسی قدیم مقدس پہاڑیاں اور کنج تباہ کر ڈالنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا جو آدی واسی قبائلیوں کی عبادت کے مرکز اور ان کے دیوی دیوتاؤں اور راکھشسوں کے گھر رہے ہیں۔ وہ اس پوری وادی کو غرق کر دینے کو بھی کوئی نقصان نہیں مانتا جہاں سے قدیم فوسل، قیمتی آثار اور چٹان پر بنی تصویریں برآمد ہوئی ہیں اور جو آثارِ قدیمہ کے ماہروں کے نزدیک بھارت کی واحد وادی ہے جہاں قدیم پتھر کے دور سے لے کر اب تک کی انسانی تہذیب کے متواتر آثار موجود ہیں۔

آپ کیا کہہ سکتے ہیں؟

کیوڑیا کالونی میں سب سے زیادہ ظالمانہ مذاق وہاں کا وائلڈ لائف میوزیم ہے۔ شولپنیشور سینکچوری انٹرپریٹیشن سنٹر نے آپ کو ماحول کے تحفظ کی بابت سرکار کے احساسِ ذمہ داری سے آگاہ کرنے کے لیے ایک تیز رفتار اور جامع خاکہ تیار کر رکھا ہے۔

جب سردار سرووَر ڈیم اپنی مکمل اونچائی کو پہنچ جائے گا تو اس کا ذخیرۂ آب عمدہ ترین جنگلی زمین کے 13 ہزار ہیکٹیئر رقبے کو ڈبو دے گا۔ (اس غرقابی کو مقدر سمجھ کر جنگل کو پچھلے کئی لالچی برسوں میں

مسلسل کاٹا جاتا رہا ہے۔) اس غرقابی سے جنگلی حیات کی آماجگاہ اور حیاتی تنوع کو جو نقصان پہنچنے والا ہے اس کے بارے میں ماحولیاتی ماہرین اور ماحول کے تحفظ کے کارکن بجا طور پر تشویش میں مبتلا ہیں۔ اس نقصان کی تلافی کرنے کے لیے سرکار نے شولپنیشور وائلڈ لائف سینکچوری کو، جو ندی کے جنوب میں پورے ڈیم کے اوپر متمکن ہے، وسعت دینے کا فیصلہ کیا۔ ایک احمقانہ سکیم تیار کی گئی جس کے تحت ذخیرۂ آب میں ڈوبنے والے جنگل سے جانوروں کو 'وائلڈ لائف کی خصوصی راہداریوں' میں سے تیرا کر اس نئی (!) ترقی یافتہ (!) شولپنیشور سینکچوری میں ان کے آرام دہ گھروں تک پہنچایا جائے گا۔ مفروضہ یہ ہے کہ جنگلی حیات اور حیاتی تنوع کا تحفظ صرف اس صورت میں ممکن ہے کہ انسانی سرگرمی کو محدود کیا جائے اور جنگلی وسائل کے استعمال کے روایتی حق پر پابندی لگائی جائے۔ شولپنیشور سینکچوری کی حدود میں آنے والے 101 گاؤوں کے تقریباً چالیس ہزار آدی واسی اپنی زندگی کے لیے جنگل پر انحصار کرتے تھے۔ انھیں وہاں سے جانے پر 'آمادہ' کیا جائے گا۔

یہ بھی منصوبے سے متاثر ہونے والوں (PAPs) میں شامل نہیں ہیں۔
وہ کہاں جائیں گے؟ میں سمجھتی ہوں اب آپ اس کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

حقیقی دنیا میں ان کی مصیبتیں چاہے کچھ بھی ہوں، شولپنیشور سینکچوری انٹرپریٹیشن سنٹر میں (جہاں ایک بوڑھا بھُس بھرا چیتا اور ایک پھپھوندلگا کاہل ریچھ ایک کونے میں ساتھ ساتھ بسر کرنے پر مجبور ہیں) ان کے لیے پورا ایک کمرہ مخصوص کیا گیا ہے۔ کمرے کی دیواروں پر لکڑی سے تراشی ہوئی بھدی تصویریں لگی ہیں؛ یہ سرکاری طور پر منظور شدہ قبائلی آرٹ کے نمونے ہیں جن پر تختی بھی لگائی گئی ہے: ''ٹرائبل آرٹ''۔ کمرے کے وسط میں اصل ناپ کی پھونس کی بنی ایک جھونپڑی ہے جس کا دروازہ کھلا ہے۔ اندر چولھے پر دیگچی چڑھی ہے، پاس ہی زمین پر کتا سو رہا ہے اور دنیا میں بالکل امن وسکون ہے۔ جھونپڑی کے باہر آپ کو خوش آمدید کہنے کے لیے ایک آدی واسی میاں بیوی موجود ہیں —— بھدّے، کاغذی قبائلی میاں بیوی، مسکراتے ہوئے۔

مسکراتے ہوے، کیونکہ انھیں اپنے طیش کا اظہار کرنے کے وقار سے بھی محروم رکھا گیا ہے۔ یہ وہ بات ہے جو مجھ سے ہضم نہیں ہو سکی۔

لیکن کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں غلطی پر ہوں؟ کہ وہ میاں بیوی سچ مچ رضاکارانہ طور پر مسکرا رہے ہوں؟ قومی افتخار کے جذبے سے پھٹے پڑتے ہوں؟ اس اعزاز پر پھولے نہ سمارہے ہوں کہ انھیں گجرات کے کئی کروڑ پیاسے لوگوں کو پانی فراہم کرنے کے لیے اپنی زندگیوں کی قربانی دینے کا موقع ملا؟

گجرات کے لوگوں کو اس پانی کا انتظار کرتے ہوے اب بیس برس سے زیادہ ہو گئے ہیں جو ان کے خیال میں اس طلسمی نہر کے ذریعے ان تک پہنچنے والا ہے۔ برسوں سے گجرات کی سرکار اپنے آبپاشی کے کل بجٹ کا 85 فیصد حصہ سردار سرودر منصوبے پر خرچ کرتی آرہی ہے۔ ہر چھوٹے، کم وقت میں تیار ہونے والے، مقامی، زیادہ قابلِ عمل منصوبے کو اس عظیم منصوبے کے حق میں منسوخ کر دیا گیا ہے۔ ایک کے بعد ایک کئی الیکشن اسی 'پانی کے ٹکٹ' پر لڑے اور جیتے جا چکے ہیں۔ ہر ایک کی امیدیں اسی طلسمی نہر پر ٹکی ہوئی ہیں۔ کیا یہ نہر گجرات کے خوابوں کو پورا کرے گی؟

سردار سرودر ڈیم سے آگے نرمدا ندی زرخیز نشیبی زمین پر 180 کلومیٹر کا فاصلہ طے کر کے بھروچ کے مقام پر بحیرۂ عرب میں گرتی ہے۔ طلسمی نہر جو کچھ کرتی ہے وہ کم وبیش یہ ہے کہ اس ندی کے بڑے حصے کا رخ تقریباً نوے درجے کے زاویے پر شمال کی سمت موڑ دیا جائے۔ یہ کسی ندی کے ساتھ کی جانے والی خاصی سنگین کارروائی ہے۔ نرمدا کی جو شاخ بھروچ تک پہنچتی ہے وہ ہلسا مچھلی (بھارت کی شاید سب سے زیادہ پسند کی جانے والی مچھلی) کی افزائش کے آخری مقامات میں سے ایک ہے۔ جنوبی بھارت میں میٹور ڈیم نے کاویری ندی سے اس مچھلی کا وجود مٹا ڈالا اور پاکستان کے غلام محمد بیراج کی وجہ سے سندھ وادی میں اس پورے علاقے کو تباہ کر دیا جہاں یہ [پلا] مچھلی انڈے دیتی تھی۔ سامن مچھلی کی طرح ہلسا بھی ایناڈورس مچھلی ہے — یعنی یہ تازہ پانی میں پیدا ہوتی ہے، بچپن میں ندی سے سمندر میں چلی جاتی ہے اور پھر بالغ ہو کر انڈے دینے کے لیے بہاؤ کے خلاف تیرتی ہوئی دوبارہ ندی میں آتی ہے۔ ڈیم بننے سے پانی کے بہاؤ میں ہونے والی شدید کمی اور بہت سے ذرات کے ڈیم میں پھنسے رہ جانے سے پانی کے کیمیائی تناسب میں ہونے والی تبدیلی کے باعث ندی کی اس شاخ کا طبعی ماحول شدید طور پر بدل جائے گا اور اس کے ساتھ ہی ندی کے پانی اور سمندری پانی کا نہایت

نازک تناسب بھی تبدیل ہو جائے گا جو ہلسا مچھلی کی افزائش کے لیے کلیدی اہمیت رکھتا ہے۔ اس وقت نرمدا کا یہ زیریں حصہ ہر سال تیس ہزار ٹن ہلسا مچھلی اور تازہ پانی کے جھینگے (جن کی افزائش بھی اسی نیم نمکین پانی میں ہوتی ہے) پیدا کرتا ہے۔ تقریباً دس ہزار ماہی گیر خاندان اپنی گزر اوقات کے لیے اسی سرگرمی پر انحصار کرتے ہیں۔

مورس کمیٹی اس انکشاف پر حیرت زدہ رہ گئی تھی کہ ڈیم کے منصوبے کے سلسلے میں ندی کے زیریں حصے کے اردگرد کے ماحول کے سلسلے میں کوئی مطالعاتی جائزہ تیار نہیں کیا گیا تھا: ندی کا ماحولیاتی نظام، اس کے موسمی تغیرات، یہاں پائی جانے والی مخلوقات کی حیاتیاتی خصوصیات، اور اس خطے کے قدرتی وسائل کے استعمال کا روایتی نظام — ان میں سے کسی چیز کے بارے میں کوئی دستاویزی معلومات جمع نہیں کی گئی تھیں۔ ڈیم بنانے والوں کو یہ تک اندازہ نہ تھا کہ ڈیم کی تعمیر کے ندی کی زیریں شاخ پر کیا اثرات ہوں گے، ان اثرات کی تلافی کے لیے کیے جانے والے ممکنہ اقدامات کی بات تو جانے دیجیے۔

سرکار نے محض یہ کہہ دینا کافی سمجھا کہ وہ ہلسا مچھلی کے نابود ہو جانے کے نقصان کو ڈیم کے آبی ذخیرے میں تالابوں میں پائی جانے والی مچھلیوں سے بھر کر پورا کر لے گی۔ (ذخیرۂ آب پر کس کا کنٹرول ہوگا؟ کون یہاں مچھلی پکڑنے کے حقوق پیسے وصول کر کے اپنے پسندیدہ گاہکوں کے ہاتھ فروخت کرے گا؟) اس منصوبے میں واحد رکاوٹ یہ ہے کہ اب تک سائنسدان ہلسا مچھلی کی مصنوعی افزائش کا کوئی کامیاب طریقہ دریافت نہیں کر پائے ہیں۔ ہلسا کی افزائش کا انحصار بالغ مچھلیوں سے انڈے حاصل کرنے پر ہے جو غالب امکان ہے کہ ڈیم کی تعمیر کے باعث مکمل طور پر ختم ہو چکے ہوں گے۔ دنیا بھر میں تازہ پانی کی مچھلیوں کا پانچواں حصہ ڈیموں ہی کے باعث نیست و نابود ہوا ہے۔

تو پھر انعامی سوال وہی ہے: یہ چالیس ہزار ماہی گیر کہاں جائیں گے؟ اپنے جوابات انٹرنیٹ پر government that cares.com کے پتے پر ارسال فرمائیے۔

اپنے پڑھنے والوں کو اکتاہٹ میں مبتلا کر کے کھو بیٹھنے کے خطرے کا سامنا کرتے ہوئے (مجھے کئی بار تنبیہ کی گئی: آخر تم آبپاشی کے موضوع پر کیسے لکھ سکتی ہو؟ اس سے کس کو دلچسپی ہوگی؟) اب میں بتانا چاہتی ہوں کہ یہ طلسمی نہر کیا ہے اور اس سے کس فائدے کی امید کی جا سکتی ہے۔ اگر آپ اپنے

مستقبل کو آہنی مثلث کی غلیظ گرفت سے چھین کر واپس اپنے قبضے میں کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو اس موضوع سے دلچسپی پیدا کرنی ہوگی۔

❁

بھارت کی بیشتر ندیاں مون سون کے سہارے چلتی ہیں۔ ان کا 80 سے 85 فیصد بہاؤ بارش کے مہینوں میں یعنی عموماً جون اور ستمبر کے درمیان واقع ہوتا ہے۔ کسی ڈیم، آبپاشی کے لیے بنائے گئے ڈیم، کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کے ذخیرۂ آب میں مون سون کے بارش کے پانی کو جمع کیا جائے اور سال کے باقی مہینوں میں اس پانی کو نہروں کے ایک نظام کے ذریعے خشک زمین تک پہنچا کر احتیاط کے ساتھ استعمال کیا جائے۔ نہروں کے ذریعے سیراب ہونے والے اس پورے علاقے کو 'کمانڈ ایریا' کہا جاتا ہے۔ یہ پورا علاقہ —— جو زراعت کے اعتبار سے بارانی علاقہ ہے، جو مون سون کی بارش سے اگائی جانے والی سال کی ایک فصل کا عادی ہے اور جہاں کا پورا ماحولیاتی نظام اسی واحد سالانہ فصل کے معمول کی بنیاد پر استوار ہے —— سارا سال ہونے والی کاشت کے معمول پر کس ردعمل کا اظہار کرے گا؟ مسلسل نہری آبپاشی زمین کے ساتھ وہی سلوک کرتی ہے جو انسانی جسم کے ساتھ اسے مصنوعی طور پر متحرک کرنے والی سٹیرائڈ دوائیں کرتی ہیں۔ یہ دوائیں ایک عام ایتھلیٹ کو اولمپک میں تمغہ جیتنے والا ہیرو بنا سکتی ہیں؛ اسی طرح نہری آبپاشی سال میں ایک فصل دینے والی زمین کو سال میں کئی فصلیں دینے والی زمین میں بدل سکتی ہے۔ جس زمین پر کسان روایتی طور پر ایسی فصلیں اگاتے تھے جنھیں کم پانی درکار ہوتا ہے (مثلاً مکئی، باجرا، جو اور مختلف قسم کی دالیں)، وہی زمین اچانک بے تحاشا پانی پینے والی اور نقدی کے عوض بکنے والی فصلیں اگلنے لگتی ہے —— کپاس، چاول، سویابین، اور (1950 کی دہائی میں مقبول ہونے والی بڑی بڑی گاڑیوں کی طرح) سب سے زیادہ پانی پینے والا گنا۔ اس سے کمانڈ ایریا میں فصلوں کا روایتی نظام بالکل بدل جاتا ہے۔ لوگ وہ فصلیں اگانا چھوڑ دیتے ہیں جنھیں وہ خود کھانے کی استطاعت رکھتے تھے، اور وہ فصلیں اگانے لگتے ہیں جنھیں وہ صرف بیچ سکتے ہیں۔ خود کو اس طرح 'منڈی' سے منسلک کر کے وہ اپنی زندگیوں پر قابو کھو بیٹھتے ہیں۔

بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ ماحولیاتی اعتبار سے یہ ایک ہلاکت خیز سودا ہے۔ منڈیاں اگر قائم رہ بھی جائیں تو زمین کی صلاحیت قائم نہیں رہتی۔ رفتہ رفتہ وہ خود سے کیے جانے والے ان غیر معمولی مطالبات کو پورا کرنے کی سکت سے محروم ہوتی چلی جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ، بالکل اسی طرح جیسے اسٹیرائڈ دوائیں استعمال کرنے والا ایتھلیٹ ایک اپاہج میں بدلتا چلا جاتا ہے، زمین ناقص اور ناکارہ ہونے لگتی ہے، اس کی پیداوار گھٹنے لگتی ہے۔ بھارت میں جس زمین کو کنویں کے پانی سے سیراب کیا جاتا ہے وہ نہری نظام سے سیراب ہونے والی زمین کے مقابلے میں اب تقریباً دگنی پیداوار دیتی ہے۔ بعض زمینیں مسلسل نہری آبپاشی کے لیے دوسری زمینوں کے مقابلے میں کم موزوں ہوتی ہیں۔ مسلسل نہری آبپاشی سے زمین کی تہہ میں پانی کی سطح اونچی ہونے لگتی ہے۔ جوں جوں پانی اوپر کی طرف بڑھتا ہے، مٹی کے نمکیات کو جذب کرتا جاتا ہے۔ یہ نمکین پانی مٹی کی زیرِ زمین حرکت کے باعث زمین کی سطح پر آ جاتا ہے اور زمین سیم زدہ (water-logged) ہو جاتی ہے۔ یہ سیم کا پانی پودوں کے ذریعے پورے قدرتی ماحول میں پھیل جاتا ہے جس سے زمین کی سطح پر نمکیات کی مقدار بڑھتی جاتی ہے۔ جب یہ نمکیات ایک فیصد کے برابر ہو جائیں تو مٹی نباتات کے لیے زہریلی ہو جاتی ہے۔ اسے زمین میں نمک کا پھیل جانا یا تھور (salinisation) کہا جاتا ہے۔ آسٹریلیا کی نیشنل یونیورسٹی کے وسائل اور ماحول کے مطالعاتی مرکز کی ایک تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ دنیا بھر میں نہری آبپاشی سے سیراب ہونے والی زمین کا پانچواں حصہ تھور کے مرض کا شکار ہو چکا ہے۔

1980 کی دہائی کے درمیانی برسوں میں پاکستان میں نہری آبپاشی سے سیراب ہونے والی تین کروڑ 70 لاکھ ہیکٹیئر میں سے دو کروڑ 50 لاکھ ہیکٹیئر زمین سیم یا تھور یا دونوں کا شکار ہو چکی تھی۔ بھارت میں ایسی زمین کا تخمینہ 60 لاکھ سے ایک کروڑ ہیکٹیئر تک لگایا گیا ہے۔ 'خفیہ' سرکاری مطالعوں کی رو سے سردار سرودر ڈیم کے نہری نظام سے سیراب ہونے والے رقبے کا 52 فیصد حصہ سیم اور تھور کا شکار ہونے کے خطرے میں ہے۔

اور بری خبر یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔

460 کلومیٹر لمبی، اور کنکریٹ سے پکی کی گئی سردار سرودر طلسمی نہر کو اس طرح ڈیزائن کیا گیا ہے کہ وہ بارہ اضلاع میں پھیلی ہوئی بیس لاکھ ہیکٹیئر زمین کو سیراب کر سکے۔ کچھ اور سوراشٹر کے اضلاع

(جو گجرات سرکار کی چلائی ہوئی پیاس کی اشتہاری مہم کا سائن بورڈ ہیں) اس نہری نظام کی بالکل آخری نوک پر واقع ہیں۔

نہروں کا نظام علاقے میں قدرتی نکاس کے پہلے سے موجود نقشے پر اوپر سے ایک کنکریٹ کا جال بچھا دیتا ہے۔ یہ کچھ ایسا ہی ہے جیسے کسی پتے کی سطح پر بے رگوں کے جال کو تبدیل کرنے کی کوشش کی جائے۔ جہاں کہیں کوئی مصنوعی نہر کسی قدرتی نالے کا راستہ کاٹتی ہے وہاں برساتی پانی کا بہاؤ رک جاتا ہے اور زیر زمین پانی کی سطح اونچی ہونے سے زمین رفتہ رفتہ سیم زدہ ہو جاتی ہے۔ انجینئرنگ کی رو سے اس کا حل یہ ہے کہ علاقے میں موجود نکاس کے قدرتی نظام کا احتیاط کے ساتھ تفصیلی نقشہ تیار کیا جائے اور پھر آبپاشی کی نہروں کے ساتھ ساتھ اسی نقشے کے مطابق نکاس کا متبادل، مصنوعی نظام بھی تعمیر کیا جائے۔ مسئلہ، جیسا کہ آپ اندازہ کر سکتے ہیں، یہ ہے کہ یہ حل بہت مہنگا پڑتا ہے۔ سیم کے پانی کے نکاس کا نظام تعمیر کرنے کی لاگت سردار سرودر ڈیم کے منصوبے کا حصہ نہیں ہے۔ یہ لاگت عموماً آبپاشی کے اس قسم کے منصوبوں میں شامل نہیں کی جاتی۔ اس کی وجہ کیا ہے؟

جنوبی ایشیا کے لیے ورلڈ بینک کے نائب صدر ڈیوڈ ہاپر نے تسلیم کیا ہے کہ بینک عموماً جنوبی ایشیا کے آبپاشی کے منصوبوں میں زیر زمین پانی کے نکاس کے نظام کی لاگت شامل نہیں کرتا کیونکہ آبپاشی کے ایسے منصوبے جن میں نکاس کا مناسب نظام بھی شامل ہو، مالی طور پر قابل عمل نہیں ہوتے۔ زمین کے کسی رقبے کو آبپاشی کی سہولت مہیا کرنے پر جتنی رقم خرچ ہوتی ہے، اسی رقبے میں سیم کے پانی کے نکاس کا نظام تعمیر کرنے کی لاگت اس سے پانچ گنا آتی ہے۔ اس مسئلے کا ورلڈ بینک کا حل یہ ہے کہ وہ آبپاشی کا نظام قائم کرنے کے بعد اُس وقت کا انتظار کرتا ہے جب زمین میں سیم پھیل جائے۔ جب آبپاشی کے منصوبے کے لیے فراہم کی گئی پوری رقم خرچ اور زمین برباد ہو چکی ہوتی ہے اور لوگ بے بس ہو جاتے ہیں تب کون مدد کے لیے آگے آتا ہے؟ آپ کا پرانا دوست، گاؤں کا مہاجن، ورلڈ بینک، اور کون! اور اس کی جیب میں یہ موٹا سا لفافہ کیسا ہے؟ کہیں نکاس کے نظام کی تعمیر کے لیے نیا قرض تو نہیں؟

پاکستان میں ورلڈ بینک نے سندھ ندی پر واقع تربیلا ڈیم (1977) اور منگلا ڈیم (1967) تعمیر کرنے کے لیے قرض فراہم کیا تھا۔ ان دونوں ڈیموں کے کمانڈ علاقے سیم اور تھور کا شکار ہو چکے ہیں۔ اب بینک نے پاکستان کو 785 ملین ڈالر کا نیا قرض سیم کے پانی کے نکاس کے لیے مہیا کیا ہے۔

بھارت کی ریاستوں پنجاب اور ہریانہ میں بھی بینک یہی کر رہا ہے۔

نکاس کے انتظام کے بغیر نہری آبپاشی کا نظام بالکل ایسا ہی ہے جیسے تازہ خون پہنچانے والی شریانیں موجود ہوں اور گندا خون واپس لانے والی رگیں غائب۔

چونکہ ورلڈ بینک سردار سرودر منصوبے سے کنارہ کش ہو گیا ہے اس لیے یہ بات واضح نہیں کہ نکاس کے نظام کی تعمیر کے لیے رقم کہاں سے آئے گی۔ لیکن اس خیال نے سرکار کو نہروں کے نظام کی تعمیر جاری رکھنے سے نہیں روکا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ڈیم کے مکمل ہونے سے پہلے، طلسمی نہر کے تیار ہونے سے پہلے، اور آبپاشی کے اس نظام سے زمین کو ایک قطرہ پانی نصیب ہونے سے بھی پہلے، سیم کا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس کا بدترین شکار وہ کالونیاں ہیں جہاں بے دخل ہونے والوں کو بسایا جائے گا۔

سردار سرودر ڈیم کے منصوبہ سازوں اور اس قسم کے دوسرے منصوبے تیار کرنے والوں کے درمیان ایک فرق ہے۔ نئے منصوبہ ساز کم از کم یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ سیم اور تھور کا مسئلہ حقیقی مسئلہ ہے اور اس کے حل پر غور کرنا ضروری ہے۔ البتہ ان کا دریافت کیا ہوا حل ایسا مضحکہ خیز ہے جیسے بندروں کی پوری ہُولاک گبن (hoolock gibbon) نسل کو ہوننگ ہسپتال پہنچانا!

ان کا منصوبہ یہ ہے کہ پورے کمانڈ علاقے کے ہر سو مربع کلومیٹر رقبے میں ایک الیکٹرانک سنسر نصب کیا جائے جو زیرِ زمین پانی کی سطح کی مسلسل پیمائش کرتا رہے۔ (اس کا مطلب ہے کہ پورے علاقے میں کل 1800 الیکٹرانک سنسر نصب کرنے ہوں گے۔) یہ تمام سنسر ایک مرکزی کمپیوٹر سے منسلک ہوں گے جو زیرِ زمین پانی کی سطح کے بارے میں ان کی جمع کی ہوئی معلومات کا تجزیہ کرتا رہے گا اور نہروں کے ہیڈ ورکس کو ہدایت جاری کرتا رہے گا کہ جن علاقوں میں پانی کی سطح اونچی ہو رہی ہے وہاں نہروں میں پانی چھوڑنا بند کر دیا جائے۔ پورے علاقے میں ٹیوب ویل نصب کیے جائیں گے جو تین قسم کے ہوں گے: (1) صرف آبپاشی کے لیے، (2) صرف نکاس کے لیے، اور (3) آبپاشی اور نکاس دونوں کے لیے۔ ان تمام ٹیوب ویلوں کو بھی مرکزی کمپیوٹر سے کنٹرول کیا جائے گا۔ ان کے ذریعے سیم کے نمک آلود پانی کو زمین سے کھینچ کر نکالا جائے گا، اس میں احتیاط سے متعین کی ہوئی مقدار میں تازہ پانی ملایا جائے گا اور زمین کی سطح پر اور سطح کے نیچے قائم نکاس کے نالوں میں چھوڑا جائے گا۔ (نکاس کے ان نالوں کے لیے مزید زمین قبضے میں لینے کی ضرورت پڑے گی۔) کلپاورکش نامی

ادارے کے ڈاکٹر راہل رام کی تحقیق کے مطابق منصوبے میں آبپاشی کے نظام کی کارکردگی کی جو سطح مقرر کی گئی ہے، اسے حاصل کرنے کے لیے طلسمی نہر میں چھوڑے جانے والے پانی کے 82 فیصد حصے کو ٹیوب ویلوں کے ذریعے زمین کے نیچے سے واپس کھینچنا ضروری ہوگا!

آبپاشی کا الیکٹرانک نظام آج تک کہیں قائم نہیں کیا گیا ہے، آزمائشی منصوبے کے طور پر بھی نہیں۔ یہ منصوبہ تیار کرنے والوں کے ذہن میں یہ خیال تک نہیں آیا کہ اس ترکیب کو کسی پہلے سے سیم اور تھور زدہ زمین پر آزما کر دیکھ لیا جائے کہ یہ قابل عمل بھی ہے یا نہیں۔ نہیں، وہ ہمارا پیسہ استعمال کر کے پورے بیس لاکھ ہیکٹیئر رقبے پر یہ الیکٹرانک نظام قائم کریں گے اور پھر دیکھیں گے کہ یہ کام کرتا ہے یا نہیں۔ اگر یہ کامیاب نہ ہوا تو کیا ہوگا؟ کچھ بھی نہیں۔ منصوبہ سازوں کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ انھیں وہی پہلے والی تنخواہ ملتی رہے گی۔ ان کی پنشن اور گریچویٹی اور وہ تمام مراعات برقرار رہیں گی جو لوگوں کو مصیبت میں ڈالنے کے صلے میں عطا کی جاتی ہیں۔

یہ نظام آخر کیسے کامیاب ہو سکتا ہے؟ یہ بالکل ایسا ہے کہ کسی کٹ کھنی گائے کا دودھ دوہنے کے لیے راکٹ بنانے کے ماہر کسی سائنسدان کو طلب کیا جائے۔ جو لوگ آبپاشی کی نہروں کی دیواریں پکی نہیں کر سکتے جب تک وہ ٹوٹ پھوٹ کر لوگوں اور فصلوں کو ناقابل بیان تباہی سے دوچار نہ کر دیں، وہ اس وسیع الیکٹرانک نظام کو کیسے چلا سکیں گے؟ یہ لوگ تو بارش ہونے پر بڑے ڈیموں کو ٹوٹ پھوٹ سے بچانے تک میں ناکام رہتے ہیں۔

ان کے تیار کیے ہوئے مطالعوں میں سے ایک کا اقتباس دیکھیے: ''اوپر بیان کیے ہوئے حالات میں زیرِ زمین اور زمین کی سطح کے پانی کو باہم ملانے کے نظام کو ڈیزائن کرنا اور اسے عمل میں لانا ایک پیچیدہ عمل ہوگا۔'' بالکل درست! بلکہ یہ اس کی دشواری کا کم سے کم بیان ہے۔ اور اس پیچیدگی سے نمٹنے کے لیے ان کی تجویز کیا ہے؟ ''یہ صرف اس صورت میں ہو سکتا ہے جب تمام زیرِ زمین پانی کے نکاس اور نہری پانی کی فراہمی کا بندوبست کسی واحد اتھارٹی کے ہاتھ میں ہو۔''

آہا!

اب بات کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی ہے۔ پانی کا مالک کون ہوگا؟ واحد اتھارٹی۔ پانی بیچے گا کون؟ واحد اتھارٹی۔ پانی کی بکری سے منافع کون کمائے گا؟ واحد اتھارٹی۔ واحد اتھارٹی کے پاس

ایک سکیم ہے جس کے تحت وہ پانی لٹر کے حساب سے بیچے گی، افراد کو نہیں بلکہ کسانوں کی کوآپریٹوز کو (جو فی الحال تو موجود نہیں ہیں لیکن واحد اتھارٹی کے لیے انھیں وجود میں لانا اور کسانوں کو کوآپریشن پر مجبور کرنا کیا مشکل ہے!) کمپیوٹر کا پانی عام پانی کے مقابلے میں مہنگا ہوتا ہے۔ یہ صرف اُن کو ملے گا جو اس کی قیمت ادا کر سکیں گے۔

رفتہ رفتہ چھوٹے کسانوں کو بڑے کسان دھکیل کر راستے سے ہٹا دیں گے اور بے دخلی کا چکر پھر سے چل پڑے گا۔

واحد اتھارٹی چونکہ کمپیوٹر کے پانی کی مالک ہوگی اس لیے وہی یہ بھی طے کرے گی کہ کون کیا اگائے گا۔ وہ کہتی ہے کہ کمپیوٹر کا پانی پانے والوں کو گنا اگانے کی اجازت نہیں ہوگی کیونکہ یہ فصل ان کروڑوں پیاسے لوگوں کے حصے کا پانی بھی پی جائے گی جو نہر کے آخری کونے پر پانی کے منتظر ہیں۔ لیکن یہی واحد اتھارٹی نہر کے شروع کے کونے کے پاس کے علاقے میں شکر سازی کے دس بڑے کارخانے لگانے کے لیے لائسنس جاری کر چکی ہے۔ اس سے پہلے ایک موقعے پر واحد اتھارٹی نے کہا تھا کہ اُکائی ڈیم کے کمانڈ علاقے کے صرف 30 فیصد رقبے کو گنے کی کاشت کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ لیکن اس علاقے کے 75 فیصد رقبے پر گنا اگایا جا رہا ہے (اور 30 فیصد علاقہ سیم زدہ ہو چکا ہے)۔ مہاراشٹر میں اسی واحد اتھارٹی کی ایک اَور شاخ کی بدولت طاقتور شوگر لابی، جو ریاست کی نہری زمین کے دس فیصد حصے پر گنا کاشت کرتی ہے، ریاست کا پچاس فیصد نہری پانی استعمال کر رہی ہے۔

گنا اگانے والوں کے علاوہ واحد اتھارٹی نے حال ہی میں ایک اَور سکیم کا بھی اعلان کیا ہے جس کے تحت طلسمی نہر کے کنارے پر فائیو سٹار ہوٹل، گولف کورس اور واٹر پارک قائم کیے جائیں گے۔ اس سکیم کا آخر کیا جواز پیش کیا جا سکتا ہے؟

واحد اتھارٹی کا کہنا ہے کہ منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے رقم اکٹھا کرنے کا یہ واحد طریقہ ہے!

مجھے ان کروڑوں پیاسے لوگوں کے بارے میں سچ مچ تشویش ہونے لگی ہے جو کچھ اور سوراشٹر میں پانی کا انتظار کر رہے ہیں۔

کیا کبھی پانی ان تک پہنچے گا؟

پہلی بات، ہم جانتے ہیں کہ ندی میں پانی کی مقدار اس سے کہیں کم ہے جتنی واحد اتھارٹی دعویٰ کرتی ہے۔

دوسری بات، نرمدا ساگر ڈیم کی غیر موجودگی میں سردار سروور ڈیم سے ہونے والا آبپاشی کا فائدہ مزید 17 سے 30 فیصد تک کم ہو جاتا ہے۔

تیسری بات، طلسمی نہر کی آبپاشی کی کارکردگی کی سطح (یعنی اس کے نہری نظام سے حاصل ہونے والے پانی کی مقدار) بے بنیاد طور پر 60 فیصد فرض کر لی گئی ہے۔ بھارت میں بنائے گئے نہری نظام کی کارکردگی کی سطح (رساؤ اور بخارات کے ذریعے ضائع ہونے والے پانی کو نگاہ میں رکھتے ہوئے) 35 فیصد سے اوپر کبھی نہیں گئی۔ اس کا مطلب ہے کہ درحقیقت کمانڈ علاقے کا صرف نصف حصہ نہر کے پانی سے سیراب ہو سکے گا۔ کون سا نصف؟ ظاہر ہے پہلا نصف۔

چوتھی بات، کچھ اور سوراشٹر تک پہنچنے کے لیے طلسمی نہر کو دس شوگر ملوں، گولف کورسوں، فائیو سٹار ہوٹلوں، واٹر پارکوں اور نقد قیمت دینے والی اجناس کے کھیتوں، اور سیاسی طاقت اور پٹیلوں کی اکثریت رکھنے والے ضلعوں —— بڑودہ، احمد آباد، کھیدا، گاندھی نگر اور مہسانہ —— سے گزرنا ہوگا۔ (واحد اتھارٹی نے، خود اپنی ہدایات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے، بڑودہ شہر کو اس نہر کے پانی کا ایک بڑا حصہ الاٹ کر دیا ہے۔ اور جب بڑودہ کو پانی ملے گا تو کیا احمد آباد پیچھے رہنے والا ہے؟ گجرات کے تمام شہری مراکز کے طاقتور سیاسی حلقے اس نہر کے پانی میں سے اپنا اپنا حصہ حاصل کر کے رہیں گے۔)

پانچویں بات، فرض کیجیے کہ پانی کچھ اور سوراشٹر تک پہنچ بھی گیا (جس کے نہ ہونے کا امکان سو فیصد ہے) تو اسے 8000 منتشر دیہات تک پہنچانے کے لیے پائپ بچھانے ہوں گے۔

یہ بات غور طلب ہے کہ دنیا بھر کے ایک ارب لوگ جو پینے کے صاف پانی تک رسائی سے محروم ہیں، ان میں سے 85 کروڑ 50 لاکھ دیہی علاقوں میں رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دیہی علاقے میں ہر طرف بکھری ہوئی آبادی تک پانی پہنچانے کے لیے ہزاروں کلومیٹر لمبی پائپ لائن، اکواڈکٹ، پمپ اور ٹریٹمنٹ پلانٹ پر مشتمل نظام قائم کرنا لازمی ہے، اور اس کی لاگت بے حد زیادہ ہے۔ بڑے ڈیم دیہی علاقوں تک پینے کا پانی پہنچانے کے لیے تعمیر نہیں کیے جاتے۔ اتنے وسائل کسی کے پاس نہیں ہوتے۔

جب موریس کمیٹی پہلی بار گجرات آئی تھی تو ان دور افتادہ دیہی علاقوں تک پانی پہنچانے کے وہاں کی سرکار کے اس عزم سے بہت متاثر ہوئی تھی۔ اس نے ان علاقوں تک پینے کا پانی پہنچانے کے تفصیلی منصوبے کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔

ایسا کوئی منصوبہ موجود نہیں تھا۔ (اب بھی نہیں ہے۔)

انھوں نے دریافت کیا کہ کیا اس کی لاگت کا کوئی تخمینہ تیار کیا گیا ہے۔ ''چند ہزار کروڑ''، ان کے سوال کا ہوائی جواب تھا۔ ایک ماہر کے لگائے ہوئے سرسری اندازے کے مطابق یہ لاگت ایک ارب ڈالر کے لگ بھگ ہوگی۔ یہ سردار سرو ور ڈیم منصوبے کی لاگت میں شامل نہیں ہے۔ تو پھر یہ رقم کہاں سے آئے گی؟

برا مت مانیے۔ میں تو یونہی پوچھ رہی تھی۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ گنگا کا رخ موڑ کر اسے کلکتہ کی بندرگاہ تک پہنچانے والے فرا کھا بیراج کے باعث بنگلہ دیش کے ان چار کروڑ لوگوں کے لیے پینے کے پانی کی قلت ہو گئی ہے جو اس ندی کے نچلے حصے آس پاس رہتے ہیں۔

بعض اوقات قوم پرستی اور حب الوطنی کی تہہ میں ایسا ہی کڑا اور سرد حساب کتاب موجود ہوتا ہے۔ ایک ڈیم چار کروڑ لوگوں کو پینے کے پانی سے محروم کرنے کے لیے۔ دوسرا ڈیم دوسرے چار کروڑ لوگوں تک پینے کا پانی پہنچانے کا ناٹک کرنے کے لیے۔

یہ کون دیوتا ہیں جن کے ہاتھوں میں ہماری تقدیر ہے؟ کیا ان کی طاقت کی کوئی حد نہیں؟

میں وادی میں جس آخری شخص سے ملی وہ بھائیجی بھائی تھا۔ وہ انڈاوا کا رہنے والا تاڑوی آدی واسی ہے۔ انڈاوا ان پہلے گاؤوں میں سے ایک ہے جہاں سے سرکار نے طلسمی نہر اور اس کے 75 ہزار کلومیٹر کے آبپاشی کے نظام کی تعمیر کے لیے زمین قبضے میں کرنی شروع کی۔ بھائیجی بھائی کی 19 میں سے 17 ایکڑ زمین طلسمی نہر کی بھینٹ چڑھ چکی ہے۔ یہ 700 فٹ چوڑی نہر اپنے دونوں کناروں کی پہاڑیوں اور

پیدل چلنے کے راستے کے ساتھ اس کی زمین پر سے یوں گزرتی ہے جیسے دیوزاد سائیکل سواروں کے سائیکل چلانے کے لیے ویلوڈروم بنایا گیا ہو۔

یہ نہری نظام دو لاکھ سے زیادہ خاندانوں کی زندگیوں کو متاثر کرتا ہے۔ لوگ اپنے کنووں اور پیڑوں سے محروم ہوئے ہیں، اس نہر نے ان کے مکانوں اور کھیتوں کو ایک دوسرے سے کاٹ دیا ہے جس کی وجہ سے وہ اب کئی کلومیٹر دور واقع نزدیک ترین پل سے ندی پار کر کے واپس اتنا ہی لمبا فاصلہ طے کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ تقریباً 23 ہزار خاندان، یعنی کوئی ایک لاکھ افراد، بھاگی بھائی کی طرح زیادہ سنگین طور پر متاثر ہوں گے۔ یہ لوگ PAPs میں شامل نہیں ہیں اور انھیں کوئی معاوضہ نہیں ملے گا۔

اپنے کیوڑیا کالونی والے ہمسایوں کی طرح بھاگی بھائی بھی راتوں رات قلاش ہو گیا۔

بھاگی بھائی اور اس کی برادری کے لوگ، جنھیں سرکاری کیلنڈروں پر چھاپی جانے والی تصویروں کے لیے مسکرانے پر مجبور کیا جاتا ہے، جنھیں اپنا طیش ظاہر کرنے کے وقار سے بھی محروم رکھا جاتا ہے، جنھیں اس ملک نے (جسے ان سے اپنا ملک سمجھنے کی توقع کی جاتی ہے) کیڑوں کی طرح کچل کر رکھ دیا ہے۔

شام گہری ہو چکی تھی جب میں اس کے گھر پہنچی۔ ہم ڈھلتی روشنی میں اس کے مکان کے فرش پر بیٹھ گئے اور بہت میٹھی چائے پینے لگے۔ اسے بات کرتا دیکھ کر مجھ میں کسی یاد نے جنبش کی، مجھے کسی دیکھی ہوئی چیز کا سا احساس ہوا۔ میں اس کی وجہ نہ سمجھ سکی۔ میں جانتی تھی کہ اس سے پہلے میں اس سے کبھی نہیں ملی۔ تب اچانک مجھ پر اصل بات کا انکشاف ہوا۔ میں نے اس کی صورت نہیں پہچانی تھی بلکہ اس کی کہانی کو پہچان گئی تھی۔ میں نے اسے دس سال پہلے کی بنائی ہوئی ایک دستاویزی فلم میں دیکھا تھا۔ اب وہ پہلے سے زیادہ لاغر ہو چکا تھا اور اس کی ڈاڑھی عمر ڈھلنے سے نرم پڑ گئی تھی۔ لیکن اس کی کہانی نہیں بدلی تھی۔ وہ اب بھی ویسی ہی جوان اور جذبے سے بھرپور تھی۔ جس صبر کے ساتھ اس نے اپنی کہانی سنائی اس نے میرا دل پارہ پارہ کر دیا۔ میں صاف دیکھ سکتی تھی کہ وہ یہ کہانی بے شمار دفعہ اس سے پہلے سنا چکا ہے، اس امید اور دعا کے ساتھ کہ کسی نہ کسی دن اِدھر سے گزرنے والا کوئی اجنبی اس کے لیے خوشخبری ——یا خدا—— ثابت ہوگا۔

بھائیِ بھائی، بھائیِ بھائی، تمھیں غصہ کب آئے گا؟ تم انتظار کرنا کب ختم کرو گے؟ کب تم کہو گے: ''بہت ہو چکا!'' اور اپنے ہتھیاروں کی طرف، چاہے وہ جو بھی ہوں، ہاتھ بڑھاؤ گے؟ تم اپنی پوری، گونج دار، دہشت ناک، ناقابلِ تسخیر طاقت کب دکھاؤ گے؟ تمھارا یقین کب ٹوٹے گا؟ کیا تم اس یقین کو توڑو گے؟ یا یہ تمھیں توڑ ڈالے گا؟

کسی جانور کو اپاہج کرنے کے لیے اس کے پیر توڑ دیے جاتے ہیں۔ کسی قوم کو اپاہج کرنے کے لیے اس کے لوگوں کو توڑا جاتا ہے۔ ان سے ان کی قوتِ ارادی چھین لی جاتی ہے۔ ان کی تقدیر پر اپنے مکمل کنٹرول کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ ان پر یہ بات واضح کر دی جاتی ہے کہ یہ فیصلہ ہم کریں گے کہ کسے زندہ رہنا ہے، کسے مر جانا ہے، کسے خوشحال ہونا ہے، کسے بدحال رہنا ہے۔ اپنی صلاحیت کی نمائش کرنے کے لیے ان کو دکھایا جاتا ہے کہ ہم کیا کچھ کر سکتے ہیں اور کس آسانی کے ساتھ کر سکتے ہیں۔ کس طرح ہم صرف بٹن دبا کر پوری زمین کو نیست و نابود کر سکتے ہیں۔ کیسے جنگ شروع کر سکتے ہیں اور امن قائم کر سکتے ہیں۔ کس طرح ایک شخص سے اس کی ندی چھین کو دوسرے شخص کو دے سکتے ہیں۔ کس طرح ایک صحرا کو سرسبز کر سکتے ہیں، یا جنگل کو اکھاڑ کر اسے دوسری جگہ اگا سکتے ہیں۔ اپنی من مانی کر کے قدیم چیزوں — زمین، جنگل، پانی، ہوا — پر لوگوں کے بڑے بڑے گروہوں کے یقین کو مجروح کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد ان کے پاس کیا رہ جاتا ہے؟ صرف ہم! وہ ہمارے پاس آئیں گے، کیونکہ ہمارے سوا ان کے پاس کچھ نہیں۔ وہ ہم سے نفرت کرنے کے باوجود ہم سے محبت کریں گے۔ وہ ہمیں اچھی طرح جاننے کے باوجود ہم پر بھروسا کریں گے۔ وہ ہمیں ووٹ دیں گے حالانکہ ہم نے ان کے جسموں سے زندگی کی آخری رمق تک نچوڑ لی ہے۔ ہم انھیں جو کچھ پینے کو دیں گے انھیں وہی پینا ہوگا۔ ہم انھیں جیسی ہوا مہیا کریں گے انھیں اسی میں سانس لینا ہوگا۔ ہم جہاں ان کا سامان دھر دیں گے انھیں اسی جگہ رہنا ہوگا۔ اس کے سوا وہ کر کیا سکتے ہیں؟ ان کے لیے اس سے اونچی کوئی عدالت نہیں ہے۔ ہم ان کے مائی باپ ہیں۔ ہم جج بھی ہیں اور جیوری بھی۔ ہم پوری دنیا ہیں۔ ہم خدا ہیں۔

طاقت صرف اُس چیز سے مضبوط نہیں ہوتی جسے وہ تباہ کرتی ہے، وہ اُس چیز سے بھی مضبوطی حاصل کرتی ہے جسے اس نے تخلیق کیا ہو؛ صرف اس چیز سے نہیں جو وہ لیتی ہے بلکہ اس چیز سے بھی جو وہ دیتی ہے۔ اور ناطاقتی بھی صرف اُس چیز سے گہری نہیں ہوتی جس سے کسی کو محروم کر دیا گیا ہو، بلکہ ان

لوگوں کی شکرگزاری سے بھی جنھوں نے اس سے کچھ فائدہ حاصل کیا ہو (یا انھیں گمان ہو کہ انھیں فائدہ حاصل ہوا ہے)۔

موجودہ زمانے کا، سرد سانچے میں ڈھلا اقتدار بظاہر جمہوری دستوروں کی بظاہر محترم شقوں کے درمیان حفاظت سے بیٹھا ہے۔ اسے استعمال کرنے والے وہ لوگ ہیں جنھیں بظاہر آزاد شہریوں نے اپنے ووٹوں سے منتخب کیا ہے۔ لیکن اس سے پہلے انسانی تہذیب کی تاریخ کے کسی زمانے کے کسی بادشاہ، کسی مطلق فرمانروا، کسی آمر کے پاس ایسے ہتھیار نہیں تھے جیسے ان کے پاس ہیں۔

ایک ایک دن، ایک ایک ندی، ایک ایک جنگل، ایک ایک پہاڑ، ایک ایک میزائل، ایک ایک بم کے ذریعے سے ہمیں غیر محسوس طور پر مسلسل توڑا جا رہا ہے۔

بڑے ڈیم کسی قوم کی 'ترقی' کے لیے وہی اہمیت رکھتے ہیں جو ان کے فوجی اسلحہ خانوں کے لیے ایٹمی ہتھیار۔ یہ دونوں بڑے پیمانے پر ہلاکت پھیلانے والے ہتھیار ہیں۔ ان دونوں ہتھیاروں کی مدد سے سرکاریں اپنے ملک کے شہریوں کو قابو میں رکھتی ہیں۔ یہ دونوں اُس منزل کی نشانیاں ہیں جہاں انسان کی عقل اس کی زندہ رہنے کی جبلت پر غالب آگئی ہے۔ یہ دونوں انسانی تہذیب کے خود اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالنے پر اتر آنے کے مرض کی علامات ہیں۔ یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں کہ ان کے ذریعے سے انسان اور اس کے گھر —— اس زمین —— کے درمیان رشتہ کاٹ دیا جاتا ہے، بلکہ زمین اور انسان کے درمیان ایک دوسرے کو سمجھ پانے کے امکان تک کا خاتمہ کر دیا جاتا ہے۔ یہ دونوں مہلک ایجادات اس ذہانت کو ریزہ ریزہ کرنے کے لیے ہیں جو انڈے کو مرغی سے، دودھ کو گائے سے، غذا کو جنگل سے، پانی کو ندی سے، ہوا کو زندگی سے اور زمین کو انسانی وجود سے منسلک کرتی ہے۔

کیا ہم اس ذہانت کو پھر سے یکجا کر سکتے ہیں؟

شاید۔ ایک ایک انچ پر، ایک ایک بم پر، مخصوص لڑائیاں مخصوص طریقوں سے لڑ کر، ہم اس کام کا آغاز نرمدا وادی سے کر سکتے ہیں۔

۔ جولائی 1999 میں بیسویں صدی کا آخری مون سون آئے گا۔ نرمدا وادی کی غیر مسلح فوج نے اعلان کیا ہے کہ جب سردار سرووَر ڈیم کے ذخیرے میں ان کی زمین اور مکانوں کو ڈبونے کے لیے پانی بھرا جائے گا تو وہ اپنی جگہ سے نہیں ہٹیں گے۔ چاہے آپ ڈیم سے محبت کرتے ہوں یا نفرت، چاہے

آپ اس کی تعمیر کے حامی ہوں یا مخالف، مناسب یہ ہے کہ آپ کو اس قیمت کا درست اندازہ ہو جو اس کے لیے ادا کی جا رہی ہے۔ اور آپ میں اتنی ہمت بھی ہونی چاہیے کہ جس وقت یہ قیمت ادا کی جا رہی ہو اور حساب بے باق کیا جا رہا ہو تو آپ اسے کھلی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔

ہماری قیمت، ہمارا حساب۔ اُن کا نہیں۔

ضرور آیے گا۔

عفریت کا نیا جنم

پہچانا اسے؟ یہ وہی عفریت ہے جو بھوسے کو سونے میں بدل سکتا تھا۔ وہی... وہ اب واپس آ گیا ہے، اور اب کے ایک ایسے روپ میں کہ آپ اسے پہچان بھی نہیں سکتے۔ پہلی بات تو یہ کہ اب وہ محض ایک انفرادی عفریت نہیں رہا۔ میں نہیں جانتی کہ اسے ٹھیک ٹھیک کیسے بیان کیا جائے۔ چلیے یہ کہہ لیتے ہیں کہ وہ عجیب وغریب چیزوں کے ایک آمیزے، ایک سازشی گٹھ، ایک گروہ میں بدل گیا ہے، کسی ملٹی نیشنل کارپوریشن جیسا بین الاقوامی عفریت بن گیا ہے۔ رمپل سلٹلسکن (Rumpelstiltskin) ایک تصور ہے، وہ ایک پُرفریب، کج رو سفید فام منطق ہے جو بالآخر اپنے آپ کو خود ختم کر لے گی۔ لیکن فی الحال یہ عفریت ٹھیک ٹھاک ہے بلکہ ٹھیک ٹھاک سے بھی کچھ زیادہ۔ ہر ایک پر ہیکڑی جماتا ہوا۔ جو کچھ کسی گنتی میں ہے (یعنی نقدی، کیش) وہ اس کا بادشاہ ہے۔ اس نے تمام مسابقت کا صفایا کر دیا، اپنے سوا تمام بادشاہوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اپنے سے مختلف قسم کے سب بادشاہوں کو ختم کر دیا۔ اس نے ہمیں یقین دلا دیا ہے کہ اب بس وہی ہمارے پاس باقی بچا ہے۔ وہی ہماری نجات کا واحد راستہ ہے۔

کس قسم کا بادشاہ ہے یہ رمپل سلٹلسکن؟ طاقتور، بے رحم اور اسلحے سے پوری طرح لیس۔ یہ اس

☆رمپل سلٹلسکن: بچوں کی اسی نام کی مشہور کہانی کا ایک کردار جو ایک مصیبت زدہ لڑکی کی مدد کے لیے آتا ہے اور بھوسے کو سونے میں بدل کر اس کے عوض لڑکی سے اس کا ہونے والا پہلا بچہ طلب کرتا ہے۔ لڑکی کے لیے اس عہد سے آزاد ہونے کی شرط یہ ہے کہ وہ اس کردار کا اصل نام بوجھ لے۔

قسم کا بادشاہ ہے جیسا دنیا نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ خام سرمایہ اس کی اقلیم ہے، ابھرتی ہوئی منڈیاں اس کی فتوحات ہیں، منافع اس کی عبادت، اس کی سرحدیں بے سرحد اور اس کے ہتھیار نیوکلیئر ہیں۔ اس کا تصور کرنے کی، اسے پورا کا پورا اپنے احاطۂ نگاہ میں لانے کی محض کوشش کرنے کا مطلب خود کو ہوشمندی کے آخری سرے پرلے جا کر کھڑا کر دینا، دنیا بھر کے تمسخر کا ہدف بننا ہے۔ بادشاہ رمپل ایک وقت میں محض اپنا چھوٹا سا حصہ ظاہر کرتا ہے۔ اس کا دل کسی بینک اکاؤنٹ کی طرح ہے۔ اس کی ٹیلی وژن آنکھیں ہیں اور اخباری ناک، اور آپ وہی کچھ دیکھتے اور پڑھتے ہیں جو اس کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔ (اب آپ سمجھے کہ ہوشمندی کے آخری سرے پر پہنچ جانے کا کیا مطلب ہے؟) اور سنیے: اس کا منہ سراؤنڈ ساؤنڈ سٹیریو ہے جو اس کی آواز کو بے تحاشا بڑھا کر سنواتا اور باقی تمام دنیا کی آوازوں کو فلٹر کے ذریعے غائب کر دیتا ہے اور آپ ان چیختی (یا بھوک سے بلکتی یا مرتی) ہوئی آوازوں کو سن ہی نہیں پاتے، اور بادشاہ رمپل کی سرگوشیاں (اور شمالی امریکی انداز میں منہ کے اندر گھمائی ہوئی 'ر' کی آوازیں) ہی آپ کو سنائی دیتی رہتی ہیں۔

غور سے سنیے، یہ کہانی کا باقی ماندہ حصہ ہے (اس کی کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے، لیکن ایک نہ ایک دن ضرور ہوگی، اسے ختم ہونا ہی ہوگا)۔ یہ کہانی سمندروں اور براعظموں کو پار کرتی ہوئی، کبھی شاہانہ اور عالمی انداز میں اور کبھی محدود اور مقامی انداز میں پھیل رہی ہے۔ اسے سناتے ہوئے میں کہیں کہیں قصہ گوئی کے فنی اصولوں سے انحراف کرتے ہوئے بعض ٹھوس تاریخی اور جغرافیائی حقائق کی طرف اشارہ کروں گی۔ براہ کرم اسے برداشت کر لیجیے۔

اس سال (سن 2000 عیسوی) کے ماہ مارچ میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدر (سلطنت رمپلڈم کے سب سے عالی شان مدارالمہام) نے ہندوستان کا دورہ کیا۔ اس کے ساتھ اس کا اپنا بستر، رات کو لپٹ کر سونے کے لیے اپنا پروں والا تکیہ اور خوش باش تاجروں کا ایک ٹولا تھا۔ ہماری قدیم تہذیب کے مودب نمائندوں نے اس کی چاپلوسی اور درباداری میں اس قسم کا رویہ اختیار کیا جسے ابتذال کے سوا کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔ پورے پورے شہروں کو دکھاوے کی لیپا پوتی سے سجایا گیا۔ غریب باشندوں کو کھدیڑ کر سامنے سے ہٹا دیا گیا کہ کہیں وہ صدارتی نگاہ کو آلودہ نہ کر دیں۔ سڑکوں کو

صابن سے دھلوا کر ان پر غبارے اور خیر مقدمی پھریرے ٹانگ دیے گئے۔ دہلی کے غلیظ آسمان پر، خود اہمیتی کے نشے سے چور ایٹمی ڈینگ باز چھا گئے اور سیٹیاں بجا بجا کر کہنے لگے: دیکھو جی دیکھو! بل جی یہاں پدھارے ہیں کیونکہ اب ہمارے پاس بم ہے! جن ہندوستانی شہریوں میں ذرا سی بھی عزتِ نفس تھی وہ اس قدر خجل ہوئے کہ کئی روز تک اپنے بستروں سے باہر نہ نکلے۔ ناسمجھی کے باعث ہم میں بعض کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ چونکہ ہر شخص آقا کے دورے کے موقعے پر خوشی سے پھولا نہ سماتے ہوئے کسی دبّو غلام کی طرح کا برتاؤ کر رہا تھا، ہماری سمجھ میں بالکل نہ آتا تھا کہ تھوڑی بہت کسر بھی آخر کیوں رہنے دی گئی۔ ہم نے آقا کی نیوکلیئر چھتری کے نیچے ہی کیوں نہ پناہ لے لی؟ اس سے کم از کم ہم اپنا جیب خرچ بموں کے بجائے دوسری چیزوں پر خرچ کر سکتے تھے اور اس کے باوجود غلامی اور تحفظ کا یہی درجہ پا سکتے تھے۔ کیا خیال ہے؟

اس دورۂ اعظم سے فوراً پہلے ہندوستان کی حکومت نے چودہ سو اشیا کی درآمد پر سے پابندی ہٹالی جن میں دودھ، اناج، شکر اور کپاس شامل ہیں (اس کے باوجود کہ اس سال بازار میں شکر اور کپاس کی افراط تھی، اور اس کے باوجود کہ چار کروڑ پچیس لاکھ ٹن اناج سرکاری گوداموں میں پڑا سڑ رہا تھا)۔ دورے کے دوران تین ارب ڈالر (بعض لوگوں کے کہنے کے مطابق چار ارب ڈالر) کے سودے طے کیے گئے۔

چند ذاتی اسباب کی بنا پر مجھے ان میں سے ایک خاص سودے سے خاص دلچسپی تھی جس پر آگڈن انرجی گروپ نے (جو امریکہ میں کوڑا کرکٹ جلانے کی مشینیں (garbage incinerators) تیار کرنے والی سب سے بڑی کمپنی ہے) ہندوستان کی ایک ٹیکسٹائل کمپنی ایس کمارز کے ساتھ (جو سوٹنگ بلینڈز نامی شے تیار کرتی ہے) دستخط کیے۔ اب آپ سوچیے کہ گاربیج انسنریشن اور سوٹنگ بلینڈز کے درمیان آخر کون سی چیز مشترک ہو سکتی ہے؟ سوٹ انسنریشن؟ نہیں، دوبارہ سوچیے۔ گاربیج بلینڈز؟ اوں ہوں، یہ بھی نہیں۔

وسطی ہندوستان میں بہنے والی نرمدا ندی پر ایک بڑا ہائیڈل ڈیم۔ جبکہ آگڈن یا ایس کمارز میں سے کسی کو بھی اس سے پہلے کوئی بڑا ہائیڈل ڈیم بنانے یا چلانے کا تجربہ حاصل نہیں ہے۔

ایس کمارز 400 میگاواٹ کے جس منصوبے یعنی شری مہیشور ہائیڈل پروجیکٹ کی سرپرستی کر رہے ہیں وہ نرمدا وادی کے ترقیاتی منصوبے کا ایک حصہ ہے جو دنیا میں کسی بھی دریائی وادی کے لیے بنایا جانے والا عظیم ترین منصوبہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس منصوبے کے تحت تین ہزار دو سو (30 بڑے، 135 درمیانہ اونچائی کے اور باقی چھوٹے) ڈیم تعمیر کیے جائیں گے جو نرمدا ندی اور اس کی اکتالیس نہروں کو مختلف اونچائیوں والے ایک زینوں دار آبی ذخیرے میں تبدیل کر دیں گے — غلام بنائے ہوئے پانی کا ایک عظیم الشان زینہ۔ یہ منصوبہ اس ندی کے پورے طاس کے فطری ماحول کو منقلب کر دے گا، وادی کے ڈھائی کروڑ باشندوں کی زندگیوں کو متاثر کرے گا، اور چار ہزار مربع کلومیٹر پر واقع قدیم روئیدگی، برگ ریز جنگلوں، سینکڑوں عبادت گاہوں اور پتھر کے زمانے تک پہنچنے والے آثار قدیمہ کو پانی میں غرق کر دے گا۔

اب تک اس دریا پر جو ڈیم تعمیر کیے گئے ہیں وہ سب سرکاری پروجیکٹ تھے۔ مہیشور ڈیم کو ہندوستان کا پہلا بڑا پرائیویٹ ہائیڈل پاور پروجیکٹ کہا جا رہا ہے۔

اس پروجیکٹ کی سب سے دلچسپ بات یہ نہیں کہ یہ بھارت کے اُس ترقیاتی منصوبے کا حصہ ہے جس کی سب سے زیادہ شدت سے مزاحمت کی گئی ہے، بلکہ یہ کہ یہ ایک عظیم عالمی سطح کے کاروبار کا ایک جز ہے۔ مہیشور میں جو کچھ ہو رہا ہے اسے سمجھ کر، اور دنیا کی دو عظیم ترین جمہوریتوں کے درمیان طے پانے والے معاہدوں کا مطالعہ کر کے، ہم اس بات کا نہایت خفیف، ابتدائی اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہمارے ساتھ کیا کیا جا رہا ہے جبکہ ہم احمقوں کی طرح تالیاں بجا بجا کر اس عمل کا خیر مقدم کر رہے ہیں اور اسے تیز رفتار بنا رہے ہیں۔ (جب میں "ہم" کا لفظ استعمال کرتی ہوں تو اس سے میری مراد لوگ ہوتے ہیں، انسان، نہ کہ ملک اور سرکاریں۔)

ذاتی طور پر میں نے اس عمل کو سمجھنے کی جانب پہلا قدم اس سال (سن 2000 عیسوی) کے ماہ مارچ میں اس وقت اٹھایا جب میں ایک لکھنے والے کے بھیانک خواب سے گزری۔ میں نے اپنی مانوس، جانی پہچانی زبان کو ایک قربان گاہ پر ذبح ہوتے ہوئے دیکھا۔ میں اپنی اس بات کی وضاحت کرنا چاہتی ہوں۔

ٹھیک اس دن جب صدر کلنٹن ہندوستان میں تھا، دور دراز ہالینڈ میں ورلڈ واٹر فورم کا اجلاس منعقد کیا گیا۔ تین ہزار پانچ سو بینکر، تاجر، سرکاری وزیر، پالیسی ساز، انجینئر، معاشیات داں (اور یہ تاثر دینے کے لیے کہ "دوسرے فریق" کو بھی نمائندگی دی گئی ہے، مٹھی بھر سماجی کارکن، دیسی ناچ کی ٹولیاں، چند مفلس سٹریٹ تھیٹر گروپ، اور ہوا سے پھولنے والے پانی کے نقرئی نلکوں کا روپ دھارے ہوئے نصف درجن نوعمر لڑکیاں بھی) — یہ سب ہیگ کے شہر میں دنیا کے پانی کے مستقبل پر غور کرنے کے لیے جمع ہوئے تھے۔ وہاں کی گئی ہر تقریر کو 'عورتوں کو طاقت بخشنے'، 'عوام کی شراکت' اور 'جمہوریت میں گہرائی پیدا کرنے' جیسے مسالے دار فقروں سے لذیذ بنایا گیا تھا۔ لیکن پتا یہ چلا کہ اس فورم کا اصل مقصد دنیا میں پانی کی فراہمی کو پرائیویٹائز کرنے پر زور دینا تھا۔ اس قسم کی نیک ولانہ باتیں کی گئیں کہ پینے کے پانی تک رسائی کو بنیادی انسانی حقوق میں شامل ہونا چاہیے۔ اب اگر سوال کیا جاتا کہ اس بنیادی انسانی حق کو نافذ کس طرح کیا جائے گا، تو اس کا جواب نہایت سادہ تھا — پانی کی قیمت لگا کر، اسے اس کی 'اصل' قیمت پر فروخت کر کے۔ (یہ تو سب جانتے ہی ہیں کہ پانی قلیل وسائل میں شامل ہوتا جا رہا ہے اور دنیا کے ایک ارب انسان ایسے ہیں جن کو پینے کے صاف پانی تک رسائی حاصل نہیں۔) 'منڈی' کا اصول یہ ہے کہ جو شے جتنی قلیل مقدار میں موجود ہو اس کی قیمت اتنی ہی زیادہ ہو گی۔ اس اصول کے پیش نظر بنیادی انسانی حق اور 'اصل قیمت' کے درمیان رشتے کی بات کچھ چکرا دینے والی لگتی تھی۔ پہلے پہل تو اس بات کا درست مطلب میری سمجھ میں نہیں آیا — کیا یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ بنیادی انسانی حقوق صرف دولت مندوں کے لیے ہیں، یا یہ کہ صرف دولت مند لوگ ہی انسان ہیں، یا یہ کہ تمام انسان دولت مند ہیں؟ لیکن اب مجھے اس بات کا مطلب صاف صاف دکھائی دے رہا ہے۔ سردی گرمی سے محفوظ اندرونی ماحول والی ایک چمکدار سپر مارکیٹ جہاں انسانی حقوق فروخت کے لیے دستیاب ہیں اور جہاں کرسمس کے موقعے پر ایک کلیئرنس سیل بھی لگائی جاتی ہے۔ (یہاں ایک چھوٹی سی وضاحت ضروری ہے: پانی کی قدر جاننا اور اس کی قیمت لگانا دو بالکل مختلف باتیں ہیں۔ پانی کی قدر اس دیہاتی عورت سے زیادہ کوئی نہیں جان سکتا جسے پانی حاصل کرنے کے لیے میلوں پیدل چل کر جانا پڑتا ہے۔ اور اس کی ناقدری شہری باشندوں سے زیادہ کوئی نہیں کرتا جو اسے پیسے دے کر خریدتے ہیں اور پھر نل کھلا چھوڑ کر اسے ضائع ہونے دیتے ہیں۔)

ایک پُر مغز امریکی مقرر نے اپنی بات نہایت دلکش انداز میں پیش کی۔ ''خدا نے ہمیں دریا عطا کیے،'' اس نے چبا چبا کر کہنا شروع کیا، ''لیکن اس نے پانی کی تقسیم کا نظام نہیں دیا۔ اس کام کے لیے ہی پرائیویٹ انٹرپرائز کی ضرورت ہے۔'' بلاشبہ، خدا کی عطا کی ہوئی باقی تمام چیزوں کے ساتھ بھی اسی طرح کی تھوڑی بہت سٹرکچرل ایڈجسٹمنٹ کر کے ہم اس دنیا کے نظام کو بہت سادہ بنا سکتے ہیں۔ (اگر سارے سمندر مل کر ایک ہو جاتے تو کتنا بڑا سمندر بن جاتا!) پانی کا انتظام ایوین کمپنی سنبھال لے، رینڈ کمپنی زمین کو کنٹرول کرے اور ہوا کا بندوبست انرون کمپنی کے ہاتھ میں ہو۔ اور ہمارا جانا پہچانا رہیل سٹلسکن اس پورے پرائیویٹ انٹرپرائز کا اونچی تنخواہ والا سپریم چیف ایگزیکٹو آفیسر بن جائے۔

جب دنیا کی تمام ندیوں، وادیوں، جنگلوں اور پہاڑیوں کو قیمت کی پرچیاں لگا کر، دلکش پیکنگ کر کے، ترتیب سے سپر مارکیٹ کے شیلفوں پر سجا دیا جائے گا، جب تمام بھوسے، کوئلے، مٹی، لکڑی اور پانی کو سونے میں تبدیل کیا جا چکا ہوگا، تو پھر ہم اس سارے سونے کا کریں گے کیا؟ تباہ شدہ دنیا کے بچے کچھے حصے کو نیست و نابود کرنے کے لیے ایٹم بم بنائیں گے اور برباد کر دی گئی دنیا میں خیالی قوموں کو وجود بخشیں گے؟

ایک لکھنے والے کی پوری زندگی زبان کے قلب تک سفر کرنے میں گزرتی ہے کہ کسی طرح لفظ اور خیال کے درمیانی فاصلے کو ختم نہیں تو کم سے کم کیا جا سکے۔ ''زبان میرے خیالات کے بدن کی کھال ہے،'' ایک بار جب کسی نے زبان کے بارے میں سوال کیا تو میں نے جواب دیا تھا۔ ہیگ کے اس اجلاس میں میری ملاقات ایک دوسرے گروہ، ایک ذیلی دنیا کے لوگوں سے ہوئی جن کی تمام زندگی کی جدوجہد میرے بالکل مخالف سمت میں تھی۔ ان کے لیے زبان کا اصل مقصد خیالات پر پردہ ڈالنا ہے۔ وہ اپنی روزی کی خطیر رقمیں اپنی کمپنی کے منافعے کو ظاہر کرنے والے چارٹوں کو دلفریب اسلوب میں لکھی ہوئی، سیاسی طور پر مثالی، اور سماجی انصاف کی اصطلاحوں سے بھری ہوئی پالیسی دستاویزوں میں منقلب کرنے سے کماتے ہیں جن کو تیار کرنے کا مقصد ان پر عمل درآمد کرنا نہیں بلکہ صرف کاغذ پر رکھنا، اور یہاں تک کہ جن لوگوں کی بھلائی کے نام پر انھیں لکھا جاتا ہے ان سے (بلکہ خاص طور پر انھی سے) خفیہ رکھا جانا ہوتا ہے۔ ان کے قول اور ان کی بیچی ہوئی اشیا کے درمیان جو فاصلہ پایا جاتا ہے یہ کارندے اسی فاصلے کے باشندے ہیں۔ یہ جس بات کی وکالت کر رہے ہیں وہ صرف دنیا کے قدرتی

وسائل اور بنیادی انسانی ضروریات کے ڈھانچے کو پرائیویٹائز کرنے کا نہیں بلکہ پالیسی سازی کے پورے عمل کو پرائیویٹائز کرنے کا معاملہ ہے۔ ڈیم بنانے والے لوگ پانی کے بارے میں سرکاری پالیسی کو کنٹرول کرنا چاہتے ہیں۔ توانائی کی تجارت کرنے والی کمپنیاں توانائی کی پالیسیاں اور مالیاتی ادارے حکومت کی سرمایہ نکالنے کی پالیسیاں خود تیار کرنے کے خواہش مند ہیں۔

آیئے بات کو بالکل ابتدا سے شروع کرتے ہیں۔ پرائیویٹائزیشن کا اصل مطلب کیا ہے؟ اس کا مطلب ہے عوامی پیداواری اثاثوں کے انتظام کا ریاست کے ہاتھ سے نکل کر پرائیویٹ سیکٹر کے تاجروں کے ہاتھ میں منتقل ہو جانا۔ ان پیداواری اثاثوں میں قدرتی وسائل بھی شامل ہیں۔ زمین، جنگل، پانی، ہوا — یہ تمام چیزیں لوگوں کی ملکیت ہیں اور ریاست کے پاس لوگوں کی امانت کے طور پر رہتی ہیں۔ بھارت جیسے ملکوں میں لوگوں کی ستر فیصد تعداد دیہی علاقوں میں رہتی ہے۔ یہ تعداد ستر کروڑ انسانوں پر مشتمل ہے۔ ان کی زندگیوں کا پورا دارومدار قدرتی وسائل تک رسائی پر ہے۔ قدرتی وسائل کو ان انسانوں سے چھین کر سٹاک کے طور پر پرائیویٹ کمپنیوں کے سپرد کر دینا لوٹ کا ایک ایسا وحشیانہ عمل ہے جس کی ہمہ گیری کی مثال پوری تاریخ میں نہیں ملتی۔ جب آپ پانی جیسی شے کو — جو انسانی زندگی کے لیے ناگزیر ہے — پرائیویٹائز کرتے ہیں تو کیا ہوتا ہے؟ جب آپ اسے ایک فروختنی شے بنا کر اعلان کر دیتے ہیں کہ یہ اسی کو ملے گا جو اس کی نقد قیمت ادا کر سکتا ہو، تب کیا ہوتا ہے؟

1999 میں بولیویا کی حکومت نے کوچاکومبا کے شہر میں پانی کی عام فراہمی کے نظام کو پرائیویٹائز کر کے اسے ایک چالیس سالہ معاہدے کے تحت ایک بہت بڑی امریکی انجینئرنگ فرم بیکٹل کے حوالے کر دیا۔ بیکٹل نے پہلا کام یہ کیا کہ پانی کی قیمت تین گنا کر دی۔ اس طرح پانی لاکھوں لوگوں کی رسائی سے باہر نکل گیا۔ لوگ احتجاج میں سڑکوں پر نکل آئے۔ ٹرانسپورٹ کی زبردست ہڑتال نے پورے شہر کا پہیہ روک دیا۔ بولیویا کے سابق ڈکٹیٹر (اور موجودہ صدر) ہیوگو بینزر نے پولیس کو ہجوم پر گولی چلانے کا حکم دیا۔ تین لوگ مارے گئے، 175 زخمی ہوئے اور تین بچوں کی بینائی ضائع ہو گئی۔ احتجاج جاری رہا کیونکہ لوگوں کے پاس اور کوئی راستہ ہی نہ تھا — پیاس کا متبادل راستہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ اپریل 2000 میں بینزر نے مارشل لا نافذ کر دیا۔ احتجاج جاری رہا۔ آخرکار بیکٹل کمپنی کے اہلکاروں کو اپنا دفتر چھوڑ کر فرار ہونا پڑا۔ اب وہ معاہدے کو منسوخ کرنے کے سلسلے میں بولیویا کی

حکومت سے ایک کروڑ بیس لاکھ ڈالر معاوضہ حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

کوچا کومبا شہر کی آبادی پانچ لاکھ کے قریب ہے۔ تصور کیجیے کہ کسی بھارتی شہر میں، کسی چھوٹے بھارتی شہر میں بھی، کیا حال ہوگا۔

رمپیل سٹلسکن ہمیشہ اونچا سوچتا ہے۔ آج وہ بہت بڑے پیمانے کے کھیلوں کی بات کر رہا ہے: ڈیم، سڑکیں، اسلحہ، بجلی بنانے کے کارخانے، پانی کی فراہمی کے نظام، مواصلاتی رابطے کے نظام، علم کو جمع اور تقسیم کرنے کا بندوبست، حیاتیاتی تنوع، پودوں کے بیج (وہ زندگی کا اور افزائش کے پورے عمل کا مالک بننا چاہتا ہے) اور وہ تمام صنعتی نظام جو ان تمام چیزوں میں مددگار ہے۔ اس کے کارندے تیسری دنیا کے ملکوں میں بچھڑے ہوئے لوگوں کی بھلائی کے کاموں کا لبادہ اوڑھ کر وارد ہوتے ہیں۔ ان کے بریف کیسوں میں رکھی فائلوں میں کچھ اور ہی لکھا ہوتا ہے۔ وہ دراصل کیا کہہ رہے ہیں (یعنی کیا بیچ رہے ہیں) اسے سمجھنے کے لیے آپ کو ان کی زبان کی پہیلی بوجھنا سیکھنا پڑے گا۔

حال ہی میں جنرل الیکٹرک کا چیئرمین جان ویلچ ہندوستان میں ٹی وی پر نمودار ہوا۔ ''میں بھارت سرکار سے درخواست کرتا ہوں، التجا کرتا ہوں کہ دیس کے انفراسٹرکچر کو بہتر بنائے،'' اس نے کہا، اور پھر نہایت پُراثر انداز میں اپنی بات میں اضافہ کیا، ''جنرل الیکٹرک کے لیے نہیں، بلکہ خود اپنی خاطر۔'' اس نے مزید کہا کہ توانائی کے شعبے کو پرائیویٹائز کرنا ہی واحد طریقہ ہے جس کے ذریعے بھارت کی ایک ارب کی آبادی کو ڈیجیٹل نیٹ ورک میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ ''آپ انفارمیشن اور ذہنی سرمائے کی باتیں ضرور کر سکتے ہیں لیکن اگر ان کو چلانے کے لیے توانائی میسر نہ ہوگی تو آپ آنے والے انقلاب سے باہر ہی رہ جائیں گے۔''

اس کی بات کا اصل مطلب بلاشبہ یہ تھا: ''آپ ایک ارب گاہکوں پر مشتمل ایک منڈی ہیں۔ اور اگر آپ نے ہماری مشینیں نہیں خریدیں تو ہماری کمپنی آنے والے انقلاب سے باہر رہ جائے گی۔''

کیا کوئی شخص مہربانی کر کے اس آدمی کو یہ اطلاع دے گا کہ اس کے ایک ارب 'گاہکوں' میں سے 40 کروڑ بالکل ناخواندہ ہیں اور انھیں دن میں ایک بار بھی پیٹ بھر کھانا نصیب نہیں ہوتا، اور بیس کروڑ ایسے ہیں جنھیں پینے کا صاف پانی میسر نہیں؟ ان لوگوں کی پہلی ترجیح یہ ہرگز نہیں کہ انھیں ڈیجیٹل نیٹ ورک میں شامل کیا جائے۔

اس کہانی کی تہہ میں جو اصل کہانی پوشیدہ ہے وہ یہ ہے: دنیا میں چھ ایسی کارپوریشنیں ہیں جو بجلی بنانے کی مشینیں تیار کرنے کے کاروبار پر غالب ہیں۔ جنرل الیکٹرک ان میں سے ایک ہے۔ ہر سال یہ کمپنیاں بجلی بنانے کی اتنی مشینری تیار کرتی ہیں (اور ظاہر ہے اسے بیچنے کی بھی ضرورت مند ہوتی ہیں) جس کے استعمال سے بیس ہزار میگاواٹ بجلی پیدا کی جاسکتی ہے۔ متعدد عوامل کے باعث ترقی یافتہ دنیا میں بجلی پیدا کرنے کی اضافی مشینری کی طلب نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کے نتیجے میں ان عظیم ملٹی نیشنل کارپوریشنوں کے پاس بہت سی ایسی مشینری باقی رہ جاتی ہے جسے کہیں نہ کہیں ٹھکانے لگانے کے لیے وہ بے تاب رہتی ہیں۔ ہندوستان اور چین کی منڈیاں ان کارپوریشنوں کا ہدف ہیں کیونکہ ان دونوں ملکوں میں مجموعی طور پر دس ہزار میگاواٹ بجلی پیدا کرنے کی مشینری کی طلب موجود ہے۔

پہلی دنیا کو اپنی اشیا بیچنے کی ضرورت ہے، تیسری دنیا کو یہ اشیا خریدنے کی ضرورت ہے — اس باہمی ضرورت کو ایک معقول کاروباری سودا ہونا چاہیے تھا۔ مگر یہ ہے نہیں۔ بہت برسوں سے بھارت بجلی پیدا کرنے کی مشینری کی تیاری میں کم وبیش خودکفیل رہا ہے۔ سرکاری شعبے میں کام کرنے والی کمپنی بھارت ہیوی الیکٹریکلز لمیٹڈ نے بجلی پیدا کرنے کی عالمی معیار کی مشینیں تیار کیں بلکہ برآمد بھی کیں۔ لیکن اب یہ حالات بدل چکے ہیں۔ پچھلے برسوں میں بھارت سرکار نے اس کمپنی کو دیے جانے والے آرڈر کم کرکے، اور ریسرچ اینڈ ڈویلپمنٹ کے لیے مخصوص رقم میں کٹوتی کرکے، اس کے باعزت طور پر قائم رہنے کے امکانات کا تقریباً خاتمہ کردیا ہے۔ اب یہ کارخانہ محض جسمانی مزدوری کی دکان بن کررہ گیا ہے۔ اسے 'جوائنٹ وینچرز' میں شامل ہونے پر مجبور کیا جارہا ہے (ان میں سے ایک جنرل الیکٹرک کے ساتھ ہے اور دوسرا سیمنز کے ساتھ) جہاں اس کا کام محض سستے، غیر ہنرمند مزدور فراہم کرنے تک محدود ہے جبکہ اس اشتراک کے دوسرے فریق ٹیکنولوجی اور آلات فراہم کرتے ہیں۔ کیوں؟ ایسا کیوں ہے کہ ہمارے بیوروکریٹ اور سیاستدان زیادہ مہنگی، غیر ملکی، درآمد کردہ مشینری کو ترجیح دیتے ہیں؟ ہم سب کو معلوم ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو دی جانے والی رشوت اس سودے کا حصہ ہوتی ہے۔ مقامی دکان سے سامان خریدنے میں وہ بات کیسے ہوسکتی ہے! اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ جین حوالہ اسکینڈل میں جن سرکاری اہلکاروں کے نام سامنے آئے ان میں سے تقریباً نصف

توانائی کے سیکٹر سے متعلق اور بجلی بنانے کی مشینری خریدنے کے سودوں میں شریک رہے تھے۔

توانائی کے شعبے کی پرائیویٹائزیشن (یا، جیسا کہ انگریزی کا نہایت بامعنی فقرہ ہے، 'پاور پرائیویٹائزیشن') بھارت سرکار کی ترجیحات میں سرفہرست ہے۔ اس شعبے میں سرمایہ کاری کرنے والا سب سے بڑا دیس امریکہ ہے۔ (جس سے اس صدارتی دورۂ اعظم کی وجہ بھی کسی حد تک سمجھ میں آسکتی ہے۔) اس پرائیویٹائزیشن کے حق میں (سرکار اور نجی شعبے دونوں کی جانب سے) جو دلیل دی جارہی ہے وہ یہ ہے کہ گزشتہ پچاس سال میں سرکار نے اپنی ذمے داری کو پورا نہیں کیا۔ وہ مطلوبہ نتائج حاصل کرنے میں ناکام رہی۔ صوبائی بجلی بورڈ دیوالیہ ہو چکے ہیں۔ ناکارکردگی، بدعنوانی، چوری اور بھاری سبسڈی نے ان اداروں کو بالکل تباہ کر ڈالا ہے۔

پرائیویٹائزیشن کی وکالت کرتے ہوئے تیسری دنیا کے سرکاری اہلکار کی تصویر — بدعنوان، آلودہ، ذاتی فائدے کے لیے ملکی مفاد کو بیچ ڈالنے والا — اس چوکھٹے میں پوری طرح ٹھیک بیٹھتی ہے۔ پرائیویٹ سیکٹر سرکار کو ہر چیز کا قصوروار ٹھہراتا ہے۔ سرکار بھی نخریلے انداز میں اپنے قصور کا اعتراف کرتی ہے اور اپنی اصلاح کرنے کے سلسلے میں بے بسی کا اظہار کرتی ہے۔ بلکہ اس سے بھی آگے جا کر وہ اپنی ناکارکردگی کے بیان میں مبالغے سے کام لیتی ہے۔ یہ اس خیال سے کیا جاتا ہے کہ سننے والے اس کی صاف گوئی کی داد دیں۔ اپنی موت سے ذرا پہلے ایک تقریر میں توانائی کے وزیر پی آر کمار منگلم نے کہا تھا کہ توانائی کے شعبے میں خسارے کی مجموعی رقم 37 ہزار کروڑ روپے بنتی ہے۔ اس نے مزید کہا تھا کہ بھارت میں بجلی کی 35 سے 40 فیصد مقدار ٹرانسمیشن اور ڈسٹری بیوشن میں ضائع ہو جاتی ہے۔ باقی 60 فیصد بجلی میں سے بھی، وزیر کے بیان کے مطابق، صرف 40 فیصد کے بل وصول ہوتے ہیں۔ ان تمام باتوں سے اس نے یہ نتیجہ نکالا تھا: بھارت جتنی بجلی پیدا کرتا ہے اس کے صرف ایک چوتھائی حصے کو میٹر سے ناپا جاتا ہے۔ سرکاری حلقوں کی رائے میں یہ ایک مبالغہ آمیز بیان ہے۔ بجلی کے شعبے کی کارکردگی حقیقت میں ہی اتنی خراب ہے کہ اس بارے میں مبالغہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بجلی کی وزارت کے فراہم کردہ اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ ضائع ہونے بجلی کی مقدار 23 فیصد ہے۔ (1947 میں یہ مقدار 14.39 فیصد تھی۔) اگر بجلی کا وزیر مبالغے سے کام نہ بھی لے تو یہ مقدار بھارت کو ڈومینکن ریپبلک، میانمر (برما) اور بنگلہ دیش جیسے ملکوں کی صف میں شامل کرنے کو کافی ہے جہاں دنیا میں سب

سے زیادہ بجلی ضائع ہوتی ہے۔

اس صورتحال کا علاج، ہمیں اطلاع دی جاتی ہے، یہ نہیں کہ سرکاری شعبہ اپنی کارکردگی کو بہتر بنائے، نہ یہ کہ بجلی کے ضیاع میں کمی کی جائے، اور نہ یہ کہ سرکار کو اپنی ذمے داریاں پوری کرنے کے لیے زیادہ جواب دہ بنایا جائے۔ اس کے بجائے علاج یہ تجویز کیا جاتا ہے کہ سرکار اپنی ذمے داریوں سے مکمل طور پر سبکدوش ہو جائے اور بجلی کے شعبے کو پرائیویٹ سیکٹر کے حوالے کر دے۔ ایسا کرتے ہی جادو کی چھڑی گھوم جائے گی اور سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ مالی استحکام اور سوئٹزرلینڈ جیسی عمدہ کارکردگی اچانک کہیں سے نمودار ہو جائے گی۔

لیکن اس بیان میں ایک اہم بات کا ذکر غائب ہے۔ گزشتہ برسوں میں صوبائی بجلی بورڈوں کے دیوالیہ ہوتے چلے جانے کا سبب بجلی کی چوری ہے۔ بجلی کون چُرا رہا ہے؟ اس کا کچھ حصہ یقیناً غریب لوگ چراتے ہیں ـــــ پسماندہ محلوں، شہر کے کناروں پر بسی ناجائز بستیوں میں رہنے والے لوگ۔ لیکن ان لوگوں کے پاس بجلی سے چلنے والا وہ جدید سامان نہیں ہے جو اتنی بڑی مقدار میں بجلی صَرف کر سکے جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ بڑی چوری، جو میگاواٹس میں ہے، ملک کے صنعت کار، سیاستدانوں اور سرکاری افسروں کی مدد سے، کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر مدھیہ پردیش کی ریاست کو لیجیے جہاں مہیشور ڈیم بنایا جا رہا ہے۔ سات سال پہلے یہ ریاست اپنی ضرورت سے زیادہ بجلی پیدا کر رہی تھی۔ آج اسے ایک نہایت عجیب صورتحال درپیش ہے۔ بجلی کی صنعتی مانگ میں 30 فیصد کی 'کمی' ہو گئی ہے۔ بجلی کی پیداوار 3318 میگاواٹ سے 'بڑھ' کر 4520 میگاواٹ ہو گئی ہے اور ریاست کا بجلی بورڈ 1200 کروڑ روپے کا خسارہ دکھا رہا ہے۔ معائنے کی ایک مہم نے یہ راز کھول دیا۔ انکشاف ہوا کہ ریاست کے ستر فیصد صنعت کار بجلی چراتے ہیں۔ چرائی ہوئی بجلی کی قیمت 500 کروڑ روپے یعنی کل خسارے کے 41 فیصد کے برابر ہے۔ اور مدھیہ پردیش کوئی غیر معمولی مثال نہیں ہے۔ اڑیسہ، آندھرا پردیش اور دہلی میں ضائع ہونے والی بجلی کی مقدار ملکی اوسط سے کہیں زیادہ یعنی 30 اور 50 فیصد کے درمیان ہے، جس سے بجلی کی بڑے پیمانے پر چوری کا اندازہ ہوتا ہے۔

لیکن اس بارے میں کوئی بات نہیں کرتا۔ کیونکہ غریبوں پر الزام دھرنا زیادہ تسکین بخش ہے۔

کوئی بھی عام معیشت داں، منصوبہ ساز یا ڈرائنگ روم دانشور آپ کو بتائے گا کہ صوبائی بجلی بورڈوں کی تباہی کے دو سبب ہیں: (1) 'سیاسی مجبوریوں' کے باعث بجلی کی گھریلو چوری کے معاملے کو ہوا نہیں دی جاتی، اور (2) زرعی شعبے کو دی جانے والی سبسڈی سے ہونے والا کثیر نقصان۔

پہلا کام جو بجلی کا شعبہ 'اصلاحات' اور پرائیویٹائزیشن کے بعد کرنے والا ہے وہ ہے زرعی شعبے کو دی جانے والی سبسڈی میں کٹوتی اور بجلی کی قیمت میں 'حقیقت پسندانہ' (یعنی بازار کے تقاضوں کے مطابق) اضافہ۔

'سیاسی مجبوریوں' کا کیا مطلب ہے؟ ان کو اتنی خراب چیز کیوں سمجھا جاتا ہے؟ میرے نزدیک 'سیاسی مجبوریاں' سرکار کے وہ اقدامات ہیں جو ایک ڈوبتی ہوئی معیشت کو سنبھالا دینے اور مفلس ووٹروں کے مصائب کو کم کرنے کے مقاصد کے درمیان توازن پیدا کرنے کی غرض سے کیے جاتے ہیں۔ لیکن 'بازار' کے تقاضوں اور عوام کی استطاعت کے درمیان توازن پیدا کرنا کسی بھی جمہوری حکومت کی اصل، پہلی اور بنیادی ذمے داری ہے —— اور اگر نہیں ہے تو ہونی چاہیے۔ پرائیویٹائزیشن کا مقصد 'بازار' کو سیاست کے اثرات سے الگ کر دینا ہے۔ اس کا مطلب اس آخری ہتھیار کو کند کر دینا ہوگا جو بھارت کے غریب باشندوں کے پاس باقی رہ گیا ہے —— یعنی ان کا ووٹ۔ اگر ایسا ہو گیا تو انتخابات اپنی موجودہ صورت سے بھی کہیں زیادہ بڑے ڈھونگ کی صورت اختیار کر لیں گے، اور جمہوریت محض ایک نئے راک اینڈ رول بینڈ کا نام رہ جائے گا۔ غریب لوگ مذاکرات کی میز سے غائب ہو جائیں گے۔ ان کی اہمیت ختم ہو جائے گی۔

لیکن اس کا آوازہ بلند کیا جا چکا ہے۔ سبسڈی ختم کرنے کا خونی کھیل شروع ہو چکا ہے۔ دنیا اب ایک چھوٹی سی جگہ ہے۔ اسی سڑک پر تھوڑا آگے چلیں تو ہم بولیویا پہنچ جائیں گے۔

جب حکومت 'بجلی کے شعبے کی پرائیویٹائزیشن' کی بات کرتی ہے تو کیا اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ جو کوئی بھی بجلی پیدا کرنا چاہتا ہو وہ آگے آئے اور کھلی منڈی میں مسابقت میں شریک ہو جائے؟ ہرگز نہیں! بجلی کی کھلی منڈی میں کھلے پن والی کوئی بات نہیں۔ بھارت میں بجلی کے شعبے میں اصلاحات کرنے سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ متعلقہ ریاستی حکومت چند منتخب کمپنیوں کے ساتھ، بلکہ ترجیحی طور پر عظیم ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ساتھ، بجلی خریدنے کے نہایت یک طرفہ، اور صرف ایک فریق کو نفع پہنچانے

والے، معاہدوں پر دستخط کردے۔ بنیادی طور پر اس سودے کا مطلب صرف یہ نکلتا ہے کہ بجلی پیدا کرنے والے اثاثوں اور انفراسٹرکچر کی ملکیت رشوت لینے والے (سرکاری اہلکار) سے رشوت دینے والے (پرائیویٹ سیکٹر کے تاجر) کے نام منتقل ہو جائے۔ اور اس حتمی سودے میں جس قسم کی رشوتیں دی جاتی ہیں وہ پہلے سے کہیں بڑی ہیں۔ ایک بار معاہدے پر دستخط ہو جانے کے بعد پرائیویٹ کمپنیاں اتنی مہنگی بجلی پیدا کرنے کے لیے آزاد ہیں جسے خریدنے کی کوئی بھی استطاعت نہ رکھتا ہو۔ ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ ان کی پیدا کردہ بجلی بھارتی صنعت کار تک نہیں خرید سکیں گے جو ان کمپنیوں کے حق میں مہم چلانے میں اس قدر شدومد سے جٹے ہوئے ہیں۔ ان کی حالت ان گدھوں کی سی ہو گی جن کے آگے سے مُردہ جانور کوئی باہر سے آنے والا لکڑ بگھا اٹھا کر لے جائے۔

اس عمل کو کوئی اور چیز اتنی اچھی طرح واضح نہیں کرتی جتنی امریکی کمپنی انرون کی مثال جس نے ہندوستان میں پہلا پرائیویٹ بجلی سازی کا پروجیکٹ بنایا۔ انرون اور مہاراشٹر کی کانگریسی قیادت والی ریاستی حکومت کے درمیان 695 میگاواٹ کے کارخانے کی بابت بجلی کی خریداری کے معاہدے پر 1993 میں دستخط کیے گئے تھے۔ اس موقعے پر ریاست کی حزب مخالف کی پارٹیوں بی جے پی اور شوسینا نے 'سودیشی' احتجاج کے نام پر بے پناہ شور برپا کیا اور انرون اور ریاستی حکومت کے خلاف عدالتی کارروائی شروع کردی۔ انھوں نے اعلیٰ ترین سطح پر قانون شکنی اور بدعنوانی کے الزامات عائد کیے۔ ایک سال بعد جب ریاست میں انتخابات ہوئے تو یہ معاملہ بی جے پی شوسینا اتحاد کی انتخابی مہم کا مرکزی نکتہ بن گیا۔

فروری 1995 میں اس اتحاد نے انتخابات جیت لیے۔ اپنے عہد پر عمل کرتے ہوئے اس نئی سرکار نے پروجیکٹ کو بند کر دیا۔ ایک وحشیانہ، آتشیں بیان میں مسٹر آڈوانی نے "لوٹ بذریعہ لبرلائزیشن" (یہ اس کے اپنے الفاظ ہیں) کے عمل پر کاری حملہ کیا۔ اس نے تقریباً صاف لفظوں میں کانگریسی حکومت پر انرون کمپنی سے 62 کروڑ روپے کی رشوت لینے کا الزام لگایا۔ معاہدے کی منسوخی کے بعد امریکی حکومت نے مہاراشٹر کی حکومت پر دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ امریکی سفیر فرینک وارنر نے معاہدے کی منسوخی پر افسوس ظاہر کرنے کے لیے کئی بیانات جاری کیے۔ (جس دن سفیر کے طور پر اس کے عہدے کی میعاد پوری ہوئی، اس نے انرون کمپنی میں ڈائرکٹر کے طور پر شمولیت اختیار کر لی۔)

نومبر 1995 میں مہاراشٹر کی بی جے پی شوسینا حکومت نے انرون سے دوبارہ مذاکرات کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی۔ مئی 1996 میں مرکز میں بی جے پی کی قیادت میں ایک اقلیتی حکومت نے حلف اٹھایا۔ یہ حکومت صرف تیرہ دن قائم رہی اور لوک سبھا میں عدم اعتماد کی ایک قرارداد کا سامنا کرنے سے پہلے مستعفی ہوگئی۔ اپنے اقتدار کے آخری دن، جبکہ عدم اعتماد کی قرارداد کا عمل شروع ہو چکا تھا، مرکزی کابینہ نے عجلت میں لنچ پر اجلاس منعقد کیا جس میں انرون کمپنی کے حق میں مرکزی حکومت کی طرف سے جاری کی گئی کاؤنٹر گارنٹی کی (جو معاہدے کی منسوخی کے باعث کالعدم ہو چکی تھی) نئے سرے سے توثیق کردی گئی۔ اگست 1996 میں مہاراشٹر کی ریاستی حکومت نے انرون کے ساتھ ایک نئے معاہدے پر دستخط کیے جس کی شرائط ایسی عجیب تھیں کہ کسی انتہائی کلبیت زدہ شخص کو بھی بے چین کردیں۔

منسوخ شدہ معاہدے کی رو سے پروجیکٹ کے پہلے جز (695 میگاواٹ) کے سلسلے میں ہر سال 43 کروڑ امریکی ڈالر کی ادائیگی کی جانی تھی جبکہ پروجیکٹ کے دوسرے جز (2510 میگاواٹ) سے پیدا ہونے والی بجلی خریدنا ریاستی حکومت کے لیے اختیاری تھا۔ دوبارہ مذاکرات کے نتیجے میں ہونے والے نئے معاہدے کی رو سے پروجیکٹ کے دوسرے جز میں بھی بجلی کی خریداری کو مہاراشٹر حکومت کے لیے لازمی قرار دے دیا گیا اور ریاستی بجلی بورڈ کو پابند کردیا گیا کہ وہ انرون کو تین ارب ڈالر کی ادائیگی کرے۔ یہ معاہدہ ہندوستان کی تاریخ کا سب سے کثیر رقمی معاہدہ تھا۔ مختصر لفظوں میں اس معاہدے کا مطلب یہ ہے کہ بجلی کی پیداوار کی استعداد میں صرف 18 فیصد اضافے کے عوض بجلی بورڈ کو، اپنی کل آمدنی کا 70 فیصد حصہ انرون کمپنی کی نذر کرنا پڑے گا۔ ظاہر ہے اُس تمام حساب کتاب کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں جس کے تحت نئے معاہدے کے سلسلے میں ادا کی جانے والی رشوت کی رقم کا تعین کیا گیا ہوگا۔ اور نہ اس بات کا کہ اونچی اور نیچی سطحوں پر اور دائیں بائیں اس رقم کا کتنا حصہ کس کس کو پہنچا۔

لیکن کہانی یہیں ختم نہیں ہوتی۔ ہندوستان کی سپریم کورٹ نے (جس کی تاریخ یوں بھی پاکیزگی کی داستان نہیں ہے) اپنے اب تک کے سب سے زیادہ غیر معمولی فیصلے میں انرون کے خلاف دائر کی جانے والی ایک اپیل پر غور کرنے سے انکار کردیا۔

آج، چار برس بعد، اس پروجیکٹ کے مخالفین کی کہی ہوئی ایک ایک بات بالکل درست ثابت ہوئی ہے۔ انرون کے کارخانے میں جو بجلی تیار ہوتی ہے وہ اس سے مسابقت کرنے والی قریب ترین

کمپنی کی تیار کردہ بجلی کے مقابلے میں دگنی، اور مہاراشٹر میں دستیاب ارزاں ترین بجلی کے مقابلے میں سات گنی مہنگی ہے۔ مئی 2000 میں مہاراشٹر الیکٹریسٹی ریگولیٹری کمیٹی نے فیصلہ کیا تھا کہ عارضی طور پر، جب تک کہ انتہائی ضرورت پیش نہ آئے، انرون کمپنی سے بجلی نہ خریدی جائے۔ اس فیصلے کی بنیاد اس حساب کتاب پر تھی کہ انرون سے بجلی کی خریداری کے مقابلے میں محض اس کمپنی کو معاہدے کی رو سے لازم آنے والے متعینہ اخراجات ادا کرتے رہنا کہیں کم نقصان کا باعث ہوگا۔ پروجیکٹ کے محض پہلے جز کے سلسلے میں لازم آنے والے یہ اخراجات ایک ہزار کروڑ روپے سالانہ ہیں۔ دوسرے جز کے لیے یہ رقم تقریباً دگنی ہوگی۔

ایک ہزار کروڑ روپے سالانہ، اگلے چالیس سال تک!

اس اثنا میں مہاراشٹر میں صنعت کاروں نے اپنے استعمال کے لیے بجلی پرائیویٹ جنریٹروں کے ذریعے اس سے کہیں ارزاں لاگت پر تیار کرنی شروع کر دی ہے۔ صنعتی شعبے کی طرف سے بجلی کی مانگ تیزی سے کم ہونے لگی ہے۔ چونکہ ریاستی بجلی بورڈ کے پاس رقم کی سخت قلت ہے، اور اس کے سر پر انرون پیرِ تسمہ پا کی طرح سوار ہے، اس لیے اس کے پاس پرائیویٹ جنریٹروں کے ذریعے بجلی کی تیاری پر پابندی عائد کرنے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہے گا۔ یہی واحد طریقہ ہے جس کے استعمال سے صنعت کاروں کو انرون کی تیار کردہ انتہائی مہنگی بجلی خریدنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔

ہاں تو مسٹر آڈوانی، تم کیا کہہ رہے تھے "لوٹ بذریعہ لبرلائزیشن" کے بارے میں؟ کیا خوب ایماندار لیڈر ہو تم!

آپ کی خدمت میں یہ ہے ہندوتوا کا سودیشی برانڈ۔ یہ ہے 'آزاد منڈی کی معیشت۔ یہ ہے زہر آلود زبانوں کا پروپیگنڈا۔

ان سب باتوں کے باوجود، یہ ایک حقیقت ہے کہ بھارت میں بجلی کی قلت کا بحران ہے۔ لیکن ایک بحران اور بھی ہے جو اس سے کہیں زیادہ سنگین ہے۔

منصوبہ سازوں کا دعویٰ ہے کہ بھارت پچاس برس پہلے کے مقابلے میں آج اس سے بیس گنا زیادہ بجلی صرف کرتا ہے۔ وہ اسے ترقی کے ایک اشاریے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ لیکن وہ یہ حقیقت بیان نہیں کرتے کہ ستر فیصد دیہی گھرانوں کے پاس آج بھی بجلی کی سہولت موجود نہیں ہے۔ غریب

ترین ریاستوں، بہار، اتر پردیش، اڑیسہ اور راجستھان میں 85 فیصد غریب ترین لوگ، جو بیشتر دلت اور آدی واسی قبائلیوں پر مشتمل ہیں، بجلی سے بالکل محروم ہیں۔ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کے لیے یہ کیسا شرمناک، صدمہ انگیز ریکارڈ ہے۔

جب تک اس بحران کی موجودگی کو تسلیم کر کے اس کے ازالے کے لیے کچھ نہیں کیا جائے گا، مسٹر ویلچ کے لفظوں میں "ڈھیروں، ڈھیروں بجلی" پیدا کرنے کا مطلب صرف یہ ہوگا کہ یہ دولت مند طبقے کے لوگوں کی کبھی نہ مٹنے والی بھوک کی نذر ہو جائے گی۔ اس صورتحال کو درست کرنے کے لیے ایک نہایت پُر تخیل، نہایت انقلابی انداز کی سٹرکچرل ایڈجسٹمنٹ کی ضرورت ہے۔

پرائیویٹائزیشن کو ایک ناکارہ، بدعنوان ریاست کے واحد متبادل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ درحقیقت یہ کوئی متبادل نہیں ہے، صرف اسے متبادل ظاہر کیا جاتا ہے۔ بنیادی طور پر پرائیویٹائزیشن کا مطلب پرائیویٹ (ترجیحاً غیر ملکی) کمپنی، مالیاتی ادارے اور تیسری دنیا کے حکمراں طبقے کے درمیان باہمی نفع بخش کاروباری معاہدے کے سوا کچھ نہیں۔ (اس کے نتائج میں سے ایک یہ ہے کہ اس سے بدعنوانی صرف اعلیٰ سطحوں تک محدود ہو جاتی ہے۔ آپ کا ایک اوسط درجے کا سرکاری اہلکار اپنے حصے سے محروم ہونے کے خطرے سے دوچار ہے۔)

بھارت کے سیاستدانوں نے ملک کو ورلڈ بینک کے پاس حقیقتاً گروی رکھ دیا ہے۔ آج ملک کو باہر سے جتنی رقم ہاتھ آتی ہے اس سے زیادہ سود اور اصل زر کی ادائیگی میں صرف ہو جاتی ہے۔ اسے پچھلے قرض ادا کرنے کے لیے نئے قرض لینے پڑتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں، یہ اپنا سرمایہ برآمد کر رہا ہے۔ ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف جیسے ادارے اتنے برسوں سے تیسری دنیا کے ملکوں کا خون چوستے آ رہے ہیں لیکن نئے نمودار ہونے والے مظاہر کے مقابلے میں یہ دونوں مہربان شفیق بزرگ دکھائی دینے لگے ہیں۔ یہ نئی مخلوق وہ ہے جسے ایکسپورٹ کریڈٹ ایجنسیاں یا ای سی اے کہا جاتا ہے۔ اگر ورلڈ بینک ملکوں کو غلام بنانے والی ایک فوج ہے جو بہرحال اپنے قواعد وضوابط اور سرخ فیتے کی پابند ہے، تو ایکسپورٹ کریڈٹ ایجنسیوں کی حیثیت کرائے کے ان قاتل جتھوں کی سی ہے جو کسی چیز کے پابند نہیں۔ بنیادی طور پر یہ ایجنسیاں بیرونی ملکوں میں سرمایہ کاری کرنے والی کمپنیوں کو تجارتی اور سیاسی خطرات سے بیمے کا تحفظ فراہم کرتی ہیں۔ یہ جو دستاویز جاری کرتی ہیں اسے ایکسپورٹ کریڈٹ گارنٹی

کہا جاتا ہے۔ یہ ایک نہایت سادہ طریق کار ہے۔ ترقی یافتہ دنیا کی کوئی بھی کمپنی ان دیکھے خطرات سے تحفظ حاصل کیے بغیر سیاسی یا معاشی یا دونوں اعتبار سے غیر مستحکم ملکوں کو سرمایہ، سامان یا خدمات فراہم کرنے کو تیار نہیں ہوتی۔ چنانچہ وہ پرائیویٹ کمپنی کسی ایکسپورٹ کریڈٹ ایجنسی سے گارنٹی حاصل کرتی ہے۔ دوسری طرف ایکسپورٹ کریڈٹ ایجنسی اپنے دیس کی سرکار کے ساتھ معاہدہ کرتی ہے۔ اور اس دیس کی سرکار سرمایہ، سامان یا خدمات درآمد کرنے والے دیس کے ساتھ معاہدہ کرتی ہے۔ باریک دھاگوں کے اس پیچیدہ الجھیڑے کا عملی پہلو یہ ہے کہ اگر کوئی ایسی صورتحال پیدا ہو کہ ایکسپورٹ کریڈٹ ایجنسی اپنی گاہک کمپنی کو ادائیگی کرنے پر مجبور ہو جائے تو اس کے دیس کی سرکار ایجنسی کو اپنے خزانے سے ادائیگی کر کے اس رقم کو درآمد کرنے والے دیس کے سرکاری قرض کی واجب الادا رقم میں جوڑ دے گی۔ (لہٰذا اصل گارنٹی دینے والے اس بار بھی تیسری دنیا کے غریب شہری ہی ٹھہرتے ہیں۔) یہ بندوبست پیچیدہ ضرور ہے لیکن ہے نہایت عمدہ۔ اور بالکل محفوظ۔

پرائیویٹ کمپنی، ایکسپورٹ کریڈٹ ایجنسی، برآمد کرنے والے دیس کی سرکار اور درآمد کرنے والے دیس کی سرکار کے مابین ہونے والا یہ چہار فریقی انتظام سیاسی جواب دہی کے عمل کو بڑی صفائی کے ساتھ بے اثر کر دیتا ہے۔ اگرچہ یہ سب درحقیقت ایک دوسرے کے کاروباری شراکت دار ہیں، لیکن شور مچانے اور احتجاج سے تھکا دینے والی غیر سرکاری تنظیموں اور عوامی گروہوں کے غصے کا رخ ایکسپورٹ کریڈٹ ایجنسیوں کی طرف موڑ دیا جاتا ہے جن کے ٹھنڈا کرنے والے تالابوں میں یہ غصہ صنعتی فضلے کی طرح کچھ عرصے پڑا رہتا ہے جس کے بعد اسے ٹھکانے لگا دیا جاتا ہے۔ ان ایجنسیوں کی کشش (حکومتوں اور پرائیویٹ کمپنیوں دونوں کے لیے) یہ ہے کہ یہ رازدارانہ انداز میں کام کرتی ہیں اور اکتا دینے والی تفصیلات یعنی انسانی حقوق کی پامالی یا ماحولیات کے تحفظ کے رہنما اصولوں سے کوئی غرض نہیں رکھتیں۔ (جو ایک آدھ رکھتی بھی ہیں، مثلاً امریکی ایکسم بینک، انھیں اپنا طرزِ عمل تبدیل کرنے پر آمادہ کیا جا رہا ہے۔) یہ ایجنسیاں ورلڈ بینک کی سی طویل دفتری کارروائیوں کو کاٹ کر بالکل مختصر کر دیتی ہیں۔ ان کی بدولت بڑے ڈیموں کی تعمیر کے لیے (جس میں بڑی انسانی آبادیوں کو بے گھر اور مفلس کرنے کی ضرورت پڑتی ہے جو سیاسی طور پر خطرناک ثابت ہو سکتا ہے) مالی وسائل فراہم کرنا نہایت آسان ہو جاتا ہے۔ ایکسپورٹ کریڈٹ ایجنسی کی گارنٹی ہاتھ میں ہو تو ڈیولپرز کے

لیے لوگوں کی زندگی سے بے پرواہو کر کھدائی اور بھرائی کرنے اور پہاڑوں کو بارود سے اڑانے اور بند باندھنے کا کام فوراً شروع کرنا آسان ہو جاتا ہے اور انھیں پریشان کن سوالوں کا جواب دینا تو کجا، ان پر کان دھرنے تک کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

اب آیئے مہیشور ڈیم کی طرف۔

بھارت کی تاریخ کے پہلے پرائیویٹ بڑے ڈیم کو اس کے درست تناظر میں دیکھنے کے لیے پہلے مجھے بھارت میں بڑے ڈیموں کی عمومی، اور خصوصاً نرمدا وادی کے منصوبے کی مختصر مگر بھیانک تاریخ بیان کرنی ہوگی۔

ڈیموں کی عالمی صنعت کی مالیت اس وقت بیس ارب ڈالر سالانہ ہے۔ ترقی یافتہ دنیا میں بڑے ڈیموں کا استعمال ترک کیا جا رہا ہے، انھیں دھماکوں سے تباہ کیا جا رہا ہے، جس کے نتیجے میں بعض دوسری صنعتوں کی طرح یہ صنعت بھی ختم ہونے کے خطرے سے دوچار ہے اور اسے ایسی زمینوں کی بے تابانہ تلاش ہے جہاں یہ اپنا مال ڈھیر کر سکے۔ اس صنعت کی خوش قسمتی یہ ہے کہ تیسری دنیا کے بیشتر ملک، خصوصاً بھارت، بڑے ڈیموں کے تصور سے گہری وابستگی رکھتے ہیں۔

بڑے ڈیموں کی تعداد کے اعتبار سے دنیا کے تمام ملکوں میں بھارت تیسرے نمبر پر ہے۔ یہاں کے تین ہزار چھ سو ڈیم ایسے ہیں جنھیں —— بڑے ڈیموں کے موضوع پر کام کرنے والی بین الاقوامی کمیٹی کی متعین کردہ تعریف کی رو سے —— بڑے ڈیم قرار دیا جا سکتا ہے۔ ایسے چھ سو چھیانوے مزید ڈیم زیرِ تعمیر ہیں۔ جس کا مطلب ہے کہ دنیا بھر میں اس وقت جتنے بڑے ڈیم زیرِ تعمیر ہیں ان میں سے نصف بھارت میں تعمیر ہو رہے ہیں۔ ایسی اغراض کے تحت جو باعزت نہیں بلکہ کلبیت زدہ ہیں، سیاستدانوں اور منصوبہ سازوں نے بڑے ڈیموں کو قوم پرستی کی علامتوں کی شکل دے دی ہے —— یہ گویا سیمنٹ کے بنے، عظیم الجثہ، گیلے پرچم بن گئے ہیں۔ نہرو کی وہ تقریر جس میں بڑے ڈیموں کو 'نئے بھارت کے مندر' قرار دیا گیا تھا، ہر بھارتی زبان کی درسی کتابوں میں جگہ پا چکی ہے۔ سکول جانے والے ہر بچے کو سکھایا جاتا ہے کہ بڑے ڈیم بھارت کے عوام کو بھوک اور غربت سے نجات دلائیں گے۔

کیا ایسا ہو گا؟ کیا ایسا ہوا ہے؟

محض یہ سوال پوچھنے کا مطلب بغاوت، قوم دشمنی، جاسوسی اور سب سے زیادہ مضحکہ خیز طور پر 'غیر ملکی فنڈز' وصول کرنے کے الزامات کو دعوت دینا ہے۔ مسٹر آڈوانی نے (جواب ہمارے ملک کا وزیر داخلہ ہے) 31 اکتوبر کو سردار سرودر ڈیم کے مقام پر تعمیر کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ اس کی سرکار کی تین عظیم ترین کامیابیاں یہ ہیں: 1998 میں کی جانے والی ایٹمی ہتھیاروں کی آزمائشیں، 1999 کی کارگل کی جنگ، اور 2000 میں سردار سرودر ڈیم کی تعمیر کے حق میں سپریم کورٹ کا فیصلہ۔ آڈوانی نے اسے 'ترقیاتی قوم پرستی' کی فتح قرار دیا (جو 'ثقافتی قوم پرستی' ہی کا ایک اتنا ہی مسخ روپ ہے)۔ وزیر داخلہ کی طرف سے سپریم کورٹ کے فیصلے کو اپنی سرکار کی فتح قرار دینا سپریم کورٹ کی عزت میں کوئی اضافہ نہیں کرتا۔ مجھے اس کے نیوکلیئر بموں، بڑے ڈیموں اور جنگوں کو ایک دوسرے سے جوڑ کر دیکھنے کے عمل سے ذرا بھی اختلاف نہیں ہے۔ لیکن ان تینوں کو 'کامیابیاں' قرار دینا نہایت شرانگیز حرکت ہے۔ اسی تقریر میں آگے چل کر آڈوانی نے یہ عجیب و غریب الزام لگایا کہ ہم میں سے جو لوگ ڈیموں کی مخالفت کر رہے ہیں وہ "وہی لوگ" ہیں جنھوں نے ایٹمی آزمائشوں کی مخالفت کی تھی، اور یہ کہ وہ لوگ ان "بیرونی ایجنسیوں سے ملے ہوئے ہیں جو ہندوستان کو ترقی کرتا نہیں دیکھنا چاہتیں۔" بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ یہ کوئی انفرادی مریضانہ خوف نہیں بلکہ ہجوم کی دیوانگی کو ابھار کر بھیانک حقیقتوں کو دبانے کی ایک نہایت سوچی سمجھی اور خطرناک کوشش ہے۔ اس نے بابری مسجد کی مسماری سے پہلے کے دنوں میں بھی یہی طرز عمل اختیار کیا تھا۔ اور یہی وہ اب بھی کر رہا ہے۔ اس نے خبردار کر دیا ہے کہ اس کا کسی مقام پر رکنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ جو کوئی اس کی راہ میں مزاحم ہوگا اس کے ساتھ وہ ہر ایسا ہتھکنڈا استعمال کرے گا جسے وہ ضروری خیال کرے۔

اس کے باوجود، جو کچھ داؤ پر لگا ہوا ہے وہ اس قدر اہم ہے کہ خاموش رہنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ کچھ بھی ہو، ہم 1930 کی دہائی کے ان جرمنوں کی طرح تو نہیں ہونا چاہیں گے جو اپنے بچوں کو گاڑیوں میں بٹھا کر پیانو سیکھنے کی کلاسوں میں لے جاتے رہے اور ان کنسنٹریشن کیمپوں کی طرف دیکھنے سے احتراز کیا جو ان کے اردگرد تعمیر کیے جا رہے تھے — یا ہم ویسے ہی بننا چاہتے ہیں؟ کچھ سوال ایسے ہیں جن کا پوچھا جانا ناگزیر ہے۔ اور جن کا جواب دیا جانا بھی لازمی ہے۔ اس مقام پر بڑے ڈیموں پر آنے والی لاگت اور ان سے حاصل ہونے والے فائدوں کا مختصر خلاصہ ہی بیان کیا جا

سکتا ہے۔ اور فی الحال ہمیں اس کے خلاصے ہی کی ضرورت ہے۔

بھارت کے نوے فیصد بڑے ڈیم آبپاشی کے ڈیم ہیں۔ منصوبہ سازوں کے مطابق یہ بھارت کو غذائی تحفظ فراہم کرنے کی کنجی کی حیثیت رکھتے ہیں۔

سوال بڑے ڈیموں کی بدولت کتنی غذا پیدا ہوتی ہے؟

انتہائی غیر معمولی حقیقت یہ ہے کہ اس کے کوئی سرکاری اعداد و شمار وجود نہیں رکھتے۔

ڈیموں کے عالمی کمیشن کی رپورٹ کا (جسے لندن میں 16 نومبر کو نیلسن منڈیلا نے جاری کیا) بھارت سے متعلق حصہ ماہرین کی ایک ٹیم نے تیار کیا تھا جن میں آبی وسائل کے سابق سیکرٹری، مدراس انسٹی ٹیوٹ آف ڈویلپمنٹ اسٹڈیز کے سابق ڈائرکٹر، مرکزی واٹر کمیشن کے ایک سابق سیکرٹری، اور انڈین انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن کی فیکلٹی کے دو ارکان شامل تھے۔ اس مطالعے کے ایک باب میں یہ نتیجہ برآمد کیا گیا ہے کہ بھارت میں غذائی اجناس کی کل پیداوار میں بڑے ڈیموں کا حصہ دس فیصد سے کم ہے۔

دس فیصد سے کم!

غذا کی کل موجودہ پیداوار کا دس فیصد دو کروڑ ٹن بنتا ہے۔ اس سال غلے کی اس سے دگنی مقدار (4.25 کروڑ ٹن) سرکاری گوداموں میں پڑی سڑ رہی ہے جبکہ 35 کروڑ ہندوستانی شہری غربت کی سطح کے نیچے زندگی گزار رہے ہیں (اور مزید یہ کہ غلہ درآمد بھی کیا جا رہا ہے)۔ خوراک اور شہری سپلائز کی وزارت کا کہنا ہے کہ ہر سال بھارت میں غلے کی کل پیداوار کا دس فیصد حصہ چوہے کھا جاتے ہیں۔ بھارت دنیا کا واحد ملک ہوگا جو بڑے ڈیم بنا کر اور دسیوں لاکھ لوگوں کو بے گھر اور ہزاروں ہیکٹیئر زمین کو غرقاب کر کے چوہوں کو غذا فراہم کر رہا ہے۔

یہ ماننا سخت دشوار ہے کہ حالات اس قدر سنگین اور خطرناک طور پر بگڑ سکتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہی ہے۔ یہ قابلِ فہم بات ہے کہ ان حالات کے ذمے دار لوگ اپنی غلطی کا اعتراف کرنے میں دشواری محسوس کر رہے ہیں، کیونکہ بڑے ڈیموں کا آغاز کلبی انداز کی فریب دہی سے نہیں ہوا تھا۔ ان کی ابتدا ایک سہانے خواب کے طور پر ہوئی تھی۔ ان کا انجام ایک بھیانک خواب کے طور پر ہو رہا ہے۔ لیکن اب جاگ اٹھنے کا وقت آ گیا ہے۔

یہ تو ہوئی بھارت کے بڑے ڈیموں سے حاصل ہونے والے فائدے کی بات۔ آیئے اب ان پر آنے والی لاگت پر ایک نگاہ ڈالیں۔ ان بڑے ڈیموں کی تعمیر کے لیے کتنے لوگوں کو بے گھر ہونا پڑا؟

اس کا بھی کوئی سرکاری ریکارڈ موجود نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس کا کوئی ریکارڈ رکھا ہی نہیں گیا۔ اس جرم کے لیے بھارت کی ریاست کو معاف نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس کے لیے ان منصوبہ سازوں، ماہرینِ معاشیات، مالی امداد دینے والے اداروں اور باقی تمام شہری دانشوروں کو بھی معاف نہیں کیا جا سکتا جو بڑے ڈیموں کی حمایت میں اتنی مستعدی سے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

پچھلے سال، محض ہوشمندی کا امتحان کرنے کی غرض سے، میں نے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن کی تیار کردہ 54 ڈیموں کے مطالعے کی رپورٹ میں دیے گئے اوسط اعداد و شمار کی بنیاد پر ڈیموں کی تعمیر کے باعث بے گھر ہونے والوں کی تعداد کا ایک سرسری تخمینہ لگایا تھا۔ ان کے بیان کردہ اوسط کو چار سے تقسیم کر کے پچھلے پچاس برسوں میں ان لوگوں کی تعداد تین کروڑ تیس لاکھ بنتی تھی۔

اس تخمینے کا بعض معاشیات دانوں اور منصوبہ سازوں نے تمسخر اڑایا اور اسے انتہائی مبالغہ آمیز قرار دیا۔ لیکن بھارت کی دیہی ترقی کی وزارت کے سیکرٹری نے ان لوگوں کی تعداد چار کروڑ بیان کی۔

آج بڑے ڈیموں کی رپورٹ میں بھارت سے متعلق جز کے ایک باب میں بتایا گیا ہے کہ بڑے ڈیموں کے باعث بے گھر ہونے والوں کی تعداد پانچ کروڑ ساٹھ لاکھ تک ہو سکتی ہے۔

یہ تعداد کینیڈا کی کل آبادی سے دُگنی اور آسٹریلیا کی کل آبادی کے تین گنا سے زیادہ ہے۔

ذرا ٹھہر کر سوچیے۔ پچھلے پچاس برسوں میں بڑے ڈیموں کے ہاتھوں پانچ کروڑ ساٹھ لاکھ لوگ بے گھر ہو چکے ہیں اور بھارت میں اب تک ان کی باز آبادکاری کی کوئی پالیسی تیار نہیں کی گئی ہے۔

جس وقت اطلاعات کے انقلاب کے میدان میں بھارت کی معجزاتی ترقی کی تاریخ لکھی جا رہی ہو تب یہ بھی ضرور لکھا جانا چاہیے کہ پانچ کروڑ ساٹھ لاکھ لوگوں (اور ان کے بچوں اور بچوں کے بچوں) نے اپنا سب کچھ قربان کر کے اس کی قیمت ادا کی تھی۔ اپنا سب کچھ اپنے گھر، اپنی زمینیں، اپنی زبانیں، اپنی تاریخ۔

ہر شام اپنے گھر واپس آتے ہوئے آپ ان لوگوں کو اپنی کار کی کھڑکی سے دیکھ سکتے ہیں۔

کوشش کر کے ان پر نظر جمائیے۔ ان سے نگاہ مت چرائیے۔ پانچ کروڑ ساٹھ لاکھ بے گھر، مفلس اور کچلے ہوئے لوگ۔ ان میں ساٹھ فیصد سے زیادہ دلت اور آدی واسی ہیں۔ (ان اعداد و شمار میں ہولناک معنی پوشیدہ ہیں۔) نرمداوادی کے گاؤوں میں ایک کہاوت مشہور ہے: ''سوتے کو جگایا جا سکتا ہے لیکن جو سونے کا ناٹک کر رہا ہو اسے کون جگا سکتا ہے۔'' جب بات اس جبری اور غیر رضا کارانہ بے دخلی کی سیاست تک پہنچتی ہے تو پورے ملک پر ایک ہونکتا ہوا سناٹا چھایا معلوم ہوتا ہے۔ لوگوں کی نظریں اس حقیقت پر سے پھسل کر آگے بڑھ جاتی ہیں۔ وہ یوں ظاہر کرتے ہیں جیسے یہ جمہوری عمل میں محض ایک چھوٹا سا نقص ہو۔ ان میں سے جو ذرا نرم دل ہیں وہ کہتے ہیں: ''اوہو، کتنے افسوس کی بات ہے۔ بھئی ان لوگوں کو پھر سے بسایا جانا چاہیے۔'' (لیکن کہاں؟ میں چیخ کر ان سے سوال کرنا چاہتی ہوں۔ زمین کہاں ہے؟ کیا کسی نے کہیں کوئی زمین پیدا کرنے کی مشین تیار کی ہے؟)

سنگدل لوگ کہتے ہیں، ''آخر قومی ترقی کی قیمت کسی نہ کسی کو تو چکانی ہی ہے۔''

لیکن اصل بات یہ ہے کہ پانچ کروڑ ساٹھ لاکھ بے گھر لوگ محض جمہوری عمل کی چھوٹی سی کمزوری کا نتیجہ نہیں ہو سکتے۔ یہ تو قتل عام ہے، باقاعدہ خانہ جنگی ہے۔

اس انسانی قیمت کے علاوہ بڑے ڈیموں کی دل ہلا دینے والی ماحولیاتی قیمت بھی ہے۔ پچاس لاکھ ہیکٹیئر رقبے پر پھیلے جنگلوں کی غرقابی، ماحولیاتی نظام کی تباہی، دریاؤں کی بربادی، ریت سے اٹے ہوئے ناکارہ آبی ذخیرے، جنگلی حیات کو لاحق خطرات، ختم ہوتا ہوا حیاتی تنوع، اور سیم اور تھور کا شکار ہونے والی ایک کروڑ ہیکٹیئر زرعی زمین۔ آج بھارت میں اس سے کہیں زیادہ علاقے خشک سالی اور سیلاب کے خطروں کی زد میں ہیں جتنے 1947 میں تھے۔ میدانی علاقوں کے کسی دریا میں پینے کے قابل پانی نہیں ہے۔ اور یہ بات یاد رکھیے کہ 20 کروڑ بھارت واسی پینے کے صاف پانی تک رسائی سے محروم ہیں۔

منصوبہ سازوں کے سامنے جب ماضی کی غلطیاں آتی ہیں تو وہ بڑے دانشمندانہ لہجے میں کہتے ہیں، ''ہاں، یہ درست ہے کہ ہم سے غلطیاں ہوئی ہیں۔ لیکن ہم سیکھ رہے ہیں۔'' پانچ کروڑ ساٹھ لاکھ لوگوں کا گھر بار اور روزگار اور ماحولیاتی تباہی محض ان کے سیکھنے کی قیمت ہے۔ آخر یہ لوگ کب تک یوں سیکھتے رہیں گے؟

بڑے ڈیموں کے خلاف شہادتوں میں چونکا دینے والی حد تک اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن ان شہادتوں کو کسی حساب میں شامل نہیں کیا جا رہا۔ دراصل کوئی حساب رکھا ہی نہیں جا رہا۔ کسی ایک بھی ڈیم کی تعمیر کے بعد اس کا سرکاری آڈٹ یا ایسا کوئی جائزہ مرتب نہیں کیا گیا جس سے پتا لگایا جائے کہ جس مقصد سے اسے تعمیر کیا گیا تھا وہ پورا ہوا یا نہیں۔

اور یہی وہ بات ہے جس پر یقین کرنا سب سے زیادہ دشوار ہے۔ یعنی یہ کہ بھارت سرکار کے بڑے ڈیموں پر غیر متزلزل اعتقاد کی بنیاد کسی بھی ٹھوس چیز پر نہیں ہے۔ کوئی مطالعہ نہیں کیا گیا۔ احتیاط کا کوئی تقاضا پورا نہیں کیا گیا۔ کچھ بھی نہیں۔ اور ظاہر ہے ہم میں سے جو لوگ اس اعتقاد میں شک پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ غیر ملکی جاسوس ہیں۔

کیا یہ مطالبہ کرنا غیر معقول بات ہے کہ نئے ڈیموں کی تعمیر پر اس وقت تک روک لگائی جائے جب تک "ماضی کی غلطیوں" کو درست نہیں کیا جاتا اور لاکھوں لوگوں کو معاوضے کی ادائیگی اور ان کی بحالی کے حقیقی اقدامات نہیں کیے جاتے؟ یہ وہ واحد طریقہ ہے جس کے ذریعے یہ صنعت، جس کی بنیاد آج تک جھوٹ پر قائم رہی ہے، اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کر سکتی ہے۔

آیئے اب میں آپ کو نرمدا وادی کے بارے میں بتاؤں۔

نرمدا ندی کی بڑی شاخ پر جو تیس بڑے ڈیم تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے ان میں چار بے حد بڑے یعنی میگا ڈیم ہیں۔ ان میں سے صرف ایک — بارگی ڈیم — مکمل ہوا ہے۔ تین ابھی زیرِ تعمیر ہیں۔

بارگی ڈیم 1990 میں مکمل ہوا تھا۔ اس پر تخمینے سے دس گنا لاگت آئی اور اس نے انجینئروں کے لگائے ہوئے اندازے سے تین گنا زمین کو زیرِ آب کیا۔ تفصیلی سروے کا خرچ اور بھاگ دوڑ بچانے کی غرض سے سرکار نے ایک مون سون میں، کسی کو خبردار کیے بغیر، ڈیم کے پھاٹک بند کر کے ذخیرے کو پانی سے پورا بھر دیا تاکہ اس کی بلند ترین سطح کا اندازہ لگایا جا سکے۔ پانی رات کے اندھیرے میں کسانوں کے گھروں میں داخل ہو گیا۔ انھیں اپنے بچوں، اپنے مویشیوں، اپنے ساز و سامان کو اٹھا کر پہاڑیوں پر پناہ لینی پڑی۔ نرمدا کنٹرول اتھارٹی نے تخمینہ لگایا تھا کہ 101 گاؤوں کے ستر ہزار لوگ بے گھر ہوں گے۔ لیکن جب پانی پورا بھر گیا تو 162 گاؤوں کے ایک لاکھ چودہ ہزار

لوگ بے گھر ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ حکومت کے بنائے ہوئے بحالی کے 26 مراکز بھی (جن میں مکانوں کے پلاٹ تھے لیکن زرعی زمین نہیں تھی) ڈوب گئے۔ آخر کار بحالی کا کوئی کام نہیں کیا گیا۔ بے دخل کیے جانے والے لوگوں میں سے چند کو نہایت حقیر مالی معاوضہ ملا۔ بیشتر کو کچھ نہیں ملا۔ کچھ لوگ فاقوں سے مر گئے۔ باقی جبل پور کی پسماندہ بستیوں میں جا بسے اور رکشا کھینچنے والوں اور تعمیراتی مزدوروں کے طور پر کام کرنے پر مجبور ہوئے۔

آج، اپنی تکمیل کے دس برس بعد، بارگی ڈیم صرف اتنے علاقے کو سیراب کرتا ہے جتنا علاقہ اس کے باعث زیرِ آب آیا ہے۔ یعنی اس کے منصوبہ سازوں کے دعوے کے مقابلے میں صرف پانچ فیصد رقبہ! سرکار کہتی ہے کہ اس کے پاس نہریں بنانے کے لیے پیسہ نہیں ہے۔ اس کے باوجود منصوبے کے اگلے مرحلوں پر کام کا آغاز کر دیا گیا ہے، یعنی عظیم نرمدا ساگر ڈیم پر، جس کے باعث 251 گاؤں ڈوب جائیں گے۔ اور مہیشور ڈیم پر، اور بلاشبہ سردار سرودر ڈیم پر بھی جو انسانی تاریخ کا سب سے متنازعہ ڈیم ہے، کام جاری ہے۔

سردار سرودر ڈیم کی اونچائی اس وقت 90 میٹر ہے۔ مکمل ہونے پر یہ 138 میٹر کی اونچائی تک پہنچے گا۔ یہ گجرات میں واقع ہے لیکن اس کے آبی ذخیرے کے باعث جو گاؤں زیرِ آب آئیں گے وہ مہاراشٹر اور مدھیہ پردیش میں پڑتے ہیں۔ سردار سرودر ڈیم بھارت میں انسانی حقوق کی پامالی کا ایک شوکیس بن گیا ہے۔ اس نے ڈیم بطور ترقی کا دلکش کھوٹا نوچ پھینکا ہے اور اس کی پشت کی کریہہ وحشیانہ سچائی کو عیاں کر دیا ہے۔ اس کے بارے میں میں ایک اور مضمون میں تفصیل سے لکھ چکی ہوں اس لیے یہاں اختصار سے کام لوں گی۔ سردار سرودر ڈیم تقریباً پانچ لاکھ لوگوں کو بے گھر کر دے گا۔ ان میں سے نصف سے زیادہ لوگ متعین کی گئی تعریف کی رو سے منصوبے کے متاثرین میں شامل نہیں ہوتے اور کسی معاوضے کے حقدار نہیں ہوں گے۔ اس ڈیم کے باعث تیرہ ہزار ہیکٹیئر پر اگے ہوئے برگ ریز جنگل پانی میں ڈوب جائیں گے۔

1985 میں، اس سے قبل کہ کوئی تحقیقی مطالعہ کیا جاتا، اس سے پہلے کہ کسی کو اس منصوبے کی انسانی اور ماحولیاتی قیمت کا اندازہ ہوتا، ورلڈ بینک نے ڈیم کی تعمیر کے لیے 45 کروڑ ڈالر کا قرض منظور کر لیا۔ وزارت ماحولیات کی مشروط منظوری (جس کی بنیاد کسی تحقیق پر نہیں تھی) 1987 میں حاصل

ہوئی! منصوبے کے پورے عمل میں ان لوگوں سے جن کی زندگیاں اس سے متاثر ہونے والی تھیں، مشورہ کرنا تو کجا، ان کو مطلع کرنے تک کی زحمت نہیں کی گئی۔ 1993 میں، وادی کے باشندوں کی تحریک نرمدا بچاؤ آندولن کی غیر معمولی اور شاندار جدوجہد کے نتیجے میں ورلڈ بینک کو مجبوراً اس منصوبے کی مالی امداد سے ہاتھ کھینچنا پڑا۔ گجرات سرکار نے اس کے باوجود منصوبے کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ 1994 میں نرمدا بچاؤ آندولن نے سپریم کورٹ میں ایک پٹیشن دائر کی۔ چھ سال تک کورٹ نے ڈیم کی مزید تعمیر پر قانونی پابندی عائد کیے رکھی۔ 18 اکتوبر 2000 کو ایک کے مقابلے میں دو ججوں کی اکثریت سے سنائے جانے والے ایک صدمہ انگیز فیصلے میں سپریم کورٹ نے اپنی عائد کردہ یہ پابندی اٹھالی۔ چھ سال تک ڈیم کی تعمیر روکنے کو مناسب خیال کرنے کے بعد عدالت نے (نہایت بھونڈی اور ہتک آمیز زبان استعمال کرتے ہوے) نرمدا وادی کے باشندوں کی اس بات پر سرزنش کی کہ انھوں نے عدالت سے رجوع کرنے میں تاخیر سے کام لیا اور یہ کہا کہ محض اسی بنیاد پر ان کی پٹیشن مسترد کر دیے جانے کے قابل ہے۔ سپریم کورٹ نے نرمدا کے پانی کے تنازعات کے ٹریبونل کے متعین کردہ رہنما اصولوں کی بنیاد پر ڈیم کی تعمیر جاری رکھنے کی اجازت دے دی۔

عدالت نے یہ فیصلہ اس حقیقت سے پوری طرح باخبر ہوتے ہوے کیا کہ ٹریبونل کی سفارشات کی پچھلے تیرہ سال سے متواتر خلاف ورزی کی جاتی رہی ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ ماحولیات کی وزارت کی مشروط منظوری کی کوئی ایک بھی شرط پوری نہیں کی گئی۔ اس حقیقت کے باوجود کہ تیرہ سال گزرنے کے بعد بھی حکومت کی طرف سے بازآبادکاری کے لیے کوئی منصوبہ تک پیش نہیں کیا گیا۔ اس حقیقت کے باوجود کہ ٹریبونل کی ہدایت کے مطابق کسی ایک بھی گاؤں کی بحالی نہیں کی گئی ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ مدھیہ پردیش کی سرکار یہ حلفیہ بیان دے چکی ہے کہ بے دخل کیے جانے والوں کو آباد کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی زمین نہیں ہے (اور 80 فیصد بے دخل کیے جانے والے لوگ مدھیہ پردیش میں رہتے ہیں)۔ اس حقیقت کے باوجود کہ جب سے تعمیر شروع ہوئی ہے تب سے مدھیہ پردیش سرکار نے ایک ہیکٹیئر زرعی زمین بھی بے گھر ہونے والے کسی خاندان کے لیے مہیا نہیں کی ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ عدالت کو اس بات کا پورا علم تھا کہ جو خاندان ڈیم کے موجودہ اونچائی تک پہنچنے کے لیے بے گھر کیے گئے ہیں ان تک کی بازآبادکاری نہیں ہوئی ہے۔

دوسرے لفظوں میں سپریم کورٹ نے نرمدا ٹریبونل کی سفارشات کی خلاف ورزی کی نہ صرف اجازت دی ہے بلکہ حکم دیا ہے۔

''لیکن سرکاروں کی یہی تو مشکل ہے،'' نیک دل میاں بیوی کہتے ہیں۔ ''پرائیویٹ کمپنیوں میں ایسا نہیں ہوگا۔ غریب لوگوں کی بحالی اور آبادکاری جیسی چیزوں کا انتظام کہیں زیادہ بہتر ہو جائے گا۔''

لیکن مہیشور ڈیم کی تعمیر کا تجربہ ہمیں کچھ اور بتاتا ہے۔ پرائیویٹ کمپنی کے ہاتھوں صرف بدعنوانی، جھوٹ، اور وحشیانہ اور تیز رفتار جبر کا انتظام بہتر ہوتا ہے، اور کسی چیز کا نہیں۔ اور، بلاشبہ، منصوبے کی لاگت بے تحاشا بڑھ جاتی ہے۔

1994 میں مہیشور ڈیم کی تعمیر کی لاگت کا تخمینہ 465 کروڑ روپے لگایا گیا تھا۔ 1996 میں ایس کمارز کے ساتھ ہونے والے معاہدے کے بعد یہ لاگت بڑھ کر 1569 کروڑ روپے ہو گئی۔ آج یہ تخمینہ 2200 کروڑ روپے تک جا پہنچا ہے۔ ابتدا میں اس لاگت کا 80 فیصد حصہ غیر ملکی سرمایہ کاری سے حاصل ہونے والا تھا۔ غیر ملکی کمپنیوں کا پورا جلوس گزر رہا تھا — امریکی پیسیفک، جرمنی کی بیئرن ورک، وی ای ڈبلیو، سیمنز اور ہائیڈرو ریز بینک۔ اور اب اس جلوس میں امریکی کمپنی آگڈن بھی شامل ہو چکی ہے۔

نرمدا بچاؤ آندولن کے حساب کے مطابق کارخانے کے دروازے پر اس کی تیار کردہ بجلی کی لاگت 6 روپے 55 پیسے فی یونٹ ہوگی، جو ریاست میں فراہم ہونے والی ارزاں ترین ہائیڈل بجلی کے مقابلے میں 26 گنا مہنگی، تھرمل بجلی کے مقابلے میں ساڑھے پانچ گنا مہنگی، اور مرکزی گرڈ سے حاصل ہونے والی بجلی کے مقابلے میں چار گنا مہنگی ہے۔ (یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ مدھیہ پردیش کے پاس جتنی بجلی کو ٹرانسمٹ اور تقسیم کرنے کی صلاحیت ہے، اس سے 1500 میگاواٹ زائد بجلی وہاں پہلے سے پیدا کی جا رہی ہے۔)

اگرچہ مہیشور ڈیم کی پیداواری صلاحیت 400 میگاواٹ تصور کی جاتی ہے، دریا میں پانی کے بہاؤ کے پچھلے 28 سال کے جائزے سے پتا چلتا ہے کہ اس صلاحیت کی 80 فیصد بجلی صرف مون سون کے دوران پیدا ہوگی جب دریا میں پانی بھرا ہوا ہوتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ سب سے زیادہ بجلی ان مہینوں میں پیدا ہوگی جب اس کی سب سے کم ضرورت ہوتی ہے۔

ایس کمارز کو اس بات کی کوئی فکر نہیں۔ ان کے سامنے ازون کی مثال موجود ہے۔ انھوں نے اپنے معاہدے میں ایک ایسی شق شامل رکھی ہے جو حکومت کے خزانے پر انھیں اولین استحقاق دیتی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جتنی زیادہ (یا جتنی کم) بجلی پیدا کریں، اور خواہ اس کا کوئی خریدار ہو یا نہ ہو، انھیں اگلے 35 برس تک حکومت کی طرف سے کم از کم 600 کروڑ روپے سالانہ ادا کیے جانے کی ضمانت حاصل ہے۔ اور یہ رقم ان کو ریاست کے دیوالیہ بجلی بورڈ کے ملازمین کی تنخواہیں ادا کیے جانے سے بھی پہلے ادا کی جائے گی۔ آخر ایس کمارز نے ایسا کیا کارنامہ سرانجام دیا ہے کہ ان کو یہ شاہانہ مراعات حاصل ہوں؟

اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔

سو یہ ڈیم جس کی کسی کو ضرورت نہیں، اس کی تعمیر کی قیمت اصل میں کون ادا کر رہا ہے؟

سرکاری سروے کے مطابق مہیشور ڈیم کے آبی ذخیرے کے باعث 61 گاؤں زیرِ آب آئیں گے جن میں سے تیرہ پوری طرح ڈوب جائیں گے جبکہ باقی گاؤں اپنی زرعی زمین کھو بیٹھیں گے۔ حسب معمول، ان گاؤوں کے رہنے والوں کو ڈیم کی تعمیر کے منصوبے یا ان کی ہونے والی بے دخلی کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں دی گئی۔ (اور بلاشبہ جب وہ یہ خبر پانے پر عدالت میں جائیں گے تو انھیں بتایا جائے گا کہ انھوں نے بہت دیر کر دی ہے کیونکہ ڈیم کی تعمیر شروع ہو چکی ہے۔) پہلا سروے کرتے وقت لوگوں کو یہ بتایا گیا تھا کہ یہاں ریلوے لائن ڈالی جا رہی ہے۔ 1997 میں، جب پہاڑیوں کو دھماکے سے اڑانے کا عمل شروع ہوا تب لوگوں پر پہلی بار اصل منصوبے کا انکشاف ہوا اور نرمدا بچاؤ آندولن نے مہیشور کے علاقے میں کام شروع کیا۔ اس علاقے میں سروے کرنے کی ذمے دار ایجنسی وہی ہے جس نے بارگی ڈیم کے علاقے میں سروے کیا تھا۔ ہم سب جانتے ہیں کہ وہاں کیا ہوا۔

مہیشور ڈیم سے زیرِ آب آنے والے علاقے کے لوگوں کا کہنا ہے کہ سروے بالکل غلط کیا گیا ہے۔ جن گاؤوں کو زیرِ آب آنے والے علاقے میں گِنا گیا ہے، ان سے نیچی سطح پر واقع گاؤوں کو منصوبے سے متاثر ہونے والے دیہات میں شمار ہی نہیں کیا گیا۔ چونکہ مہیشور ڈیم نرمدا کے پھیلے ہوئے میدانی علاقے میں تعمیر کیا جا رہا ہے، سروے میں کی جانے والی حساب کی چھوٹی سی غلطی نتائج میں بہت زیادہ فرق پیدا کرے گی، اور بہت سے گاؤں جنھیں زیرِ آب آنے والا شمار نہیں کیا گیا، درحقیقت زیرِ

آب آ جائیں گے۔ یہ نتائج اس سے کہیں زیادہ بدتر ثابت ہوں گے جتنے بارگی ڈیم کے سلسلے میں ہوئے تھے۔

سروے میں چند اَور بھی شدید طور پر غلط مفروضات موجود ہیں۔ بازآبادکاری کے منصوبے کے ضمیمہ 6 میں بتایا گیا ہے کہ متاثر ہونے والے 61 گاؤوں میں کل ملا کر 176 پیڑ اور 38 کنویں واقع ہیں۔ گاؤں والوں نے نشاندہی کی ہے کہ صرف ایک گاؤں ـــــ پتھراڑ ـــــ میں 40 کنویں اور چار ہزار پیڑ موجود ہیں۔

پیڑوں اور کنووں کو گننے میں جو بے پروائی برتی گئی ہے اسی سے انسانوں کو شمار کرنے میں بھی کام لیا گیا ہے۔ اس کا کوئی درست تخمینہ موجود نہیں ہے کہ کتنے لوگ اس ڈیم کی تعمیر سے متاثر ہوں گے۔ پروجیکٹ کے ذمے دار حکام تک اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ سروے نئے سرے سے کیے جانے چاہییں۔ اب تک انھوں نے 61 میں سے صرف ایک گاؤں کا نیا سروے مکمل کیا ہے اور اس گاؤں میں متاثر ہونے والے گھرانوں کی تعداد پچھلے سروے کے مقابلے میں 190 سے بڑھ کر 300 ہو گئی ہے۔

ان حالات میں نرمدا بچاؤ آندولن تک کے لیے ممکن نہیں کہ منصوبے سے متاثر ہونے والے افراد کا درست تخمینہ تیار کر سکے۔ ان کا سرسری اندازہ 50 ہزار افراد کا ہے۔ ان میں نصف سے زیادہ تعداد کیوٹ، کہار اور دوسری دلت ذاتوں کی ہے ـــــ کشتی بانی، ماہی گیری، ریت نکالنے اور پانی کے پیچھے ہٹنے کے موسم میں دریائی زمین پر کاشت کرنے والے قدیم قبائلیوں کی۔ ان میں سے بیشتر کے پاس کوئی زمین نہیں، لیکن ندی ان کی پرورش کرتی ہے اور ان کے لیے باقی تمام لوگوں سے کہیں زیادہ معنی رکھتی ہے۔ اگر ڈیم تعمیر ہوا تو ان میں سے زیادہ تر لوگ اپنی روزی کے واحد ذریعے سے محروم ہو جائیں گے۔ لیکن محض اس لیے کہ وہ کسی زمین کی ملکیت نہیں رکھتے، ان کو منصوبے سے متاثر ہونے والے افراد میں شمار نہیں کیا جائے گا اور ان کی بحالی اور بازآبادکاری زیرِغور نہیں آئے گی۔

ان 61 گاؤوں میں جن کو ڈیم کے آبی ذخیرے کے باعث زیرِآب آنے کے لیے نشان زد کیا گیا ہے، جالوڑ پہلا گاؤں ہے۔ جن بارہ خاندانوں کی زمین ڈیم کے مقررہ مقام کے قریب واقع تھی، ان کی زمین کو 1985 ہی میں قبضے میں لے لیا گیا تھا۔ جب انھوں نے احتجاج کیا تو ان کی پانی کی

لائنوں میں سیمنٹ بھر دیا گیا، ان کی کھڑی فصلوں پر بلڈوزر چلا دیے گئے اور پولیس نے ان کی زمین پر زبردستی قبضہ کر لیا۔ یہ بارہ کے بارہ خاندان اب بے زمین ہیں اور یومیہ اجرت پر مزدوری کرتے ہیں۔ نئے 'پرائیویٹ' بندوبست نے ان کی مدد کے لیے کچھ نہیں کیا۔

مرکزی حکومت کی جانب سے منصوبے کی ماحولیاتی منظوری کی شرائط کے مطابق، منصوبے کے باعث بے گھر ہونے والے لوگوں کو تین سال پہلے، یعنی 1997 تک، بسا دیا جانا چاہیے تھا۔ ایس کمارز نے ابھی متاثرہ افراد کی فہرست تک تیار نہیں کی ہے، ان کو بسانے کے لیے زمین حاصل کرنے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود تعمیر کا کام جاری ہے۔ ایس کمارز کے ریاست کی سرکار کے ساتھ تعلقات اتنے مضبوط ہیں کہ انھیں شرائط پوری کرنے کا ناٹک کرنے تک کی ضرورت نہیں پڑتی۔

بھارت میں کام اسی طرح چلتا ہے۔

یہ مہیشور ڈیم کی ابتدا ہے۔ یہی وہ وراثت ہے جسے امریکہ کا آگڈن انرجی گروپ حاصل کرنے کے لیے بے تاب ہے۔ جس بات کا ان کو احساس نہیں وہ یہ ہے کہ لڑائی ابھی ختم نہیں ہوئی ہے۔ پچھلے تین برسوں میں مہیشور ڈیم کے خلاف ہونے والی جدوجہد بڑھ کر ایک سچ مچ کی سول نافرمانی کی تحریک بن چکی ہے، گو کہ اخبار پڑھنے سے آپ کو اس کے وجود کا کوئی علم نہیں ہوگا۔ بڑے ذرائع ابلاغ اس رقم پر انحصار کرتے ہیں جو ان کو اشتہاروں سے حاصل ہوتی ہے۔ ایس کمارز اپنی بلینڈڈ سوٹنگ کی بھاری تشہیر کرتے ہیں۔ پیئرس بروسنوں کے ساتھ چلائی گئی اپنی جیمز بانڈ اشتہاری کمپین کے بعد ایس کمارز نے بھارت کے سب سے بڑے فلم اسٹار ہریتک روشن کو اپنی تشہیری فلموں کے لیے سائن کیا ہے۔ یہ انتہائی غیر معمولی بات ہے کہ بلینڈڈ سوٹ پہنے کوئی خسیس آدمی کس قدر خاموش تحسین حاصل کر سکتا ہے!

پچھلے دو برس کے عرصے میں دسیوں ہزار گاؤں والوں نے ڈیم کی تعمیر کی جگہ پر کئی بار قبضہ کر کے تعمیراتی کام رکوایا ہے۔ علاقے میں ہونے والے احتجاجی مظاہروں نے جرمنی کی دو کمپنیوں بیرن ورک اور ویو کو پروجیکٹ سے ہاتھ کھینچ لینے پر مجبور کیا ہے۔ جرمنی ہی کی ایک کمپنی سیمنز میدان میں باقی رہ گئی (اسے ہرمیز، ایک جرمن ایکسپورٹ کریڈٹ ایجنسی سے ایکسپورٹ کریڈٹ گارنٹی حاصل ہونے کی توقع تھی)۔ سن 2000 کے موسم گرما میں جرمنی کی اقتصادی تعاون اور ترقی کی وزارت نے ماہرین کی ایک ٹیم بھیجی جس کی سربراہی رچرڈ ببسل کر رہا تھا (جو ورلڈ بینک کی انسپکشن ٹیم کا سابق

چیئرمین تھا) تاکہ وہ پروجیکٹ کے بازآبادکاری اور بحالی کے پہلوؤں کا آزادانہ جائزہ لے سکے۔ اس سال 15 جون کو شائع ہونے والی اس جائزے کی رپورٹ میں نہایت واضح الفاظ میں بتایا گیا کہ مہیشور ڈیم کی تعمیر کے باعث بے گھر ہونے والے لوگوں کی بازآبادکاری اور بحالی ناممکن ہوگی۔

اگست کے آخر میں سیمنز نے ہرمیز سے اپنی گارنٹی کی درخواست واپس لے لی۔ وادی کے لوگوں کو ایک لڑائی اور دوسری لڑائی کے درمیان سنبھلنے کی زیادہ مہلت نہیں ملتی۔ ستمبر میں ایس کمارز کے لوگ دورۂ امریکہ میں بھارتی وزیراعظم کے ساتھ جانے والے تجارتی وفد میں شامل تھے۔ سیمنز کا متبادل تلاش کرنے کی بے تابی میں انھیں امید تھی کہ وہ آگڈن کے ساتھ اپنی غیر رسمی مفاہمت کو باقاعدہ معاہدے کی شکل دینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ یہ خوش قسمتی ہے — آگڈن کی بھی اور مہیشور کے رہنے والوں کی بھی — کہ ایسا اب تک نہیں ہوا ہے۔

·

جس شے کو اکثر لوگ ''قومی افتخار'' کے جذبے سے موسوم کرتے ہیں، اس سے ملتا جلتا احساس مجھے زندگی میں پہلی بار اُس رات ہوا جب میں نے چار ہزار لوگوں کے ساتھ قدم ملا کر مہیشور ڈیم کی تعمیر کے مقام کی طرف مارچ کیا جہاں ہمیں معلوم تھا کہ سینکڑوں مسلح پولیس والے ہمارے منتظر ہیں۔ پچھلی شام سے وادی کے مختلف علاقوں سے لوگ آ آ کر سلگاؤں نامی گاؤں میں جمع ہونے لگے تھے۔ یہ لوگ ٹریکٹروں پر، بیل گاڑیوں میں اور پیدل وہاں پہنچے تھے۔ یہ لوگ مار کھانے، ذلت اٹھانے اور قید میں ڈالے جانے کے لیے تیار ہو کر آئے تھے۔

ہم رات تین بجے روانہ ہوئے اور تین گھنٹے تک چلتے رہے۔ کسان، مچھیرے، ریت کھودنے والے، ادیب، مصور، فلمساز، وکیل، اخبارنویس۔ پورے بھارت کے نمائندے وہاں موجود تھے۔ شہری، دیہاتی، اچھوت، غیر اچھوت۔ یہی اتحاد ہے جس سے اس تحریک کو ذہنی قوت، ذہنی بالیدگی اور غیر معمولی سخت جانی ملتی ہے۔ کھیتوں اور پانی کے چشموں کو پار کرتے ہوئے، مجھے یاد ہے، میں سوچ رہی تھی — یہ میری دھرتی ہے، یہ وہ خواب ہے جس سے میرا پورا وجود جڑا ہوا ہے، یہ میرے لیے دنیا کی کسی بھی اور چیز سے زیادہ قیمتی ہے۔ ہم صرف ایک ڈیم کے خلاف نہیں لڑ رہے تھے۔ ہم ایک فلسفے کے لیے، دنیا کو دیکھنے کے ایک مخصوص طرز کے لیے لڑ رہے تھے۔ ہم مکمل خاموشی میں آگے بڑھتے

رہے۔ کوئی کھنکھارا تک نہیں۔ کسی نے بیڑی نہیں جلائی۔ ہم پو پھٹنے کے وقت ڈیم کے مقام پر پہنچے۔ اگرچہ پولیس والے ہمارے آنے کی توقع کر رہے تھے، لیکن انھیں معلوم نہیں ہو سکا کہ ہم کس طرف سے آئے ہیں۔ ہم نے ڈیم کے مقام پر قبضہ کر لیا۔ لوگوں کو مارا گیا، ذلیل کیا گیا اور گرفتار کر لیا گیا۔ مجھے بھی گرفتار کیا گیا اور دھکیل کر ایک پرائیویٹ گاڑی میں سوار کرایا گیا جو ایس کمارز کی ملکیت تھی۔ مجھے یاد ہے کہ مجھے شرمندگی کی شدید چبھن محسوس ہوئی — اتنی ہی شدید جتنا میرا اس سے پہلے کا فخر کا احساس تھا۔ یہ بھی میری ہی دھرتی تھی۔ میری جاگیردارانہ زمین۔ جہاں پولیس کو بھی پرائیویٹائز کر دیا گیا ہے۔ (تھانے کی طرف جاتے ہوئے راستے میں پولیس والوں نے شکایت کی کہ ایس کمارز نے انھیں پچھلے دن بھر کھانے کو کچھ نہیں دیا تھا۔) اُس شام بہت ساری گرفتاریاں ہوئی تھیں اور جیل میں قیدیوں کا سمانا مشکل ہو رہا تھا۔ انتظامیہ کے اہلکار ہمت ہار بیٹھے اور جیل چھوڑ کر چلے گئے۔ لوگوں نے خود کو اندر مقفل کر لیا اور اپنے سوالوں کے جواب دیے جانے کا مطالبہ کیا۔ اب تک انھیں کوئی جواب نہیں ملا ہے۔

ہالینڈ کے ایک دستاویزی فلمساز نے حال ہی میں مجھ سے ایک نہایت سادہ سوال کیا: بھارت دنیا کو کیا سکھا سکتا ہے؟

کسی دستاویزی فلمساز کے لیے کسی چیز کو سمجھنے کے لیے اس کو دیکھنا ضروری ہے۔ مجھے تین جگہوں کا خیال آیا جو میں اسے لے جا کر دکھا سکتی تھی۔

پہلی جگہ دہلی کے نزدیک گڑگاؤں میں واقع ایک 'کال سنٹر کالج' ہے۔ میرے خیال میں ایک فلمساز کے لیے یہ دیکھنا بہت دلچسپ ہوتا کہ ایک قدیم تہذیب خود کو کس آسانی کے ساتھ مکمل طور پر حقیر بنا سکتی ہے۔ کال سنٹر کالج میں سینکڑوں انگریزی داں بھارتی نوجوانوں کو بہت بڑی ملٹی نیشنل کمپنیوں کے بیک روم میں کام سنبھالنے کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔ ان کو امریکہ اور برطانیہ سے آنے والی ٹیلیفون کالز پر پوچھے گئے سوالوں کے جواب دینے کی تربیت دی جا رہی ہے (یہ سوال کریڈٹ کارڈ کے معاملات سے لے کر ایک خراب شدہ واشنگ مشین تک کسی بھی موضوع سے متعلق ہو سکتے ہیں)۔ مقصد یہ ہے کہ کسی بھی طرح فون کرنے والے کو یہ پتا نہ چل سکے کہ اس کے سوال کا جواب دینے والا کوئی

بھارتی ہے جو دہلی کے نزدیکی علاقے کے ایک دفتر میں بیٹھا ہے۔ کال سنٹر کالجوں میں زیرِ تربیت نوجوانوں کو امریکی اور برطانوی لہجے میں انگریزی بولنا سکھایا جاتا ہے۔ ڈیوٹی کے دوران ان کو اپنے نام بھی تبدیل کرنے ہوتے ہیں۔ سُشما سوزی بن جاتی ہے، گووِند جیری، اور آڈوانی اینڈی بن جاتا ہے۔

Hi, I'm Andy, gee, hot day, innit?

Shoot, how can I help ya?

ان کارکنوں کو اپنے بیرونی ہم رتبہ کارکنوں کے مقابلے میں دسواں حصہ اجرت دی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کال سنٹر ٹریلین ڈالر مالیت کی صنعت بننے والے ہیں۔ حال ہی میں ٹاٹا کمپنی نے اعلان کیا کہ وہ اپنے فارغ کردہ بیس ہزار کارکنوں کو، مختصر مدت کی تربیت کے بعد، جس میں انھیں امریکی لہجہ اور وہاں کی بازاری زبان سکھائی جائے گی، کال سنٹر کے کاروبار میں کھپانے والے ہیں۔ اخباری رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ عمر رسیدہ کارکنوں کو شاید رات کی شفٹ میں کام کرنے میں دشواری ہو، جو امریکی کمپنیوں کی ضرورت ہے کیونکہ امریکہ اور بھارت کے وقت میں تقریباً بارہ گھنٹے کا فرق ہے۔

دوسری جگہ جہاں مجھے اس فلمساز کو لے جانے کا خیال آیا وہ راشٹریہ سویم سیوک سنگھ یا آر ایس ایس کی شاکھا تھی، جہاں اس جبری تحقیر سے پیدا ہونے والے خطرناک ردِعمل کو پالا پوسا جاتا ہے۔ جہاں عام لوگ خاکی نیکر پہن کر مارچ کرتے ہیں اور یہ سیکھتے ہیں کہ ایٹمی ہتھیاروں کا ذخیرہ، مذہبی جنون، عورت بیزاری، انسان دشمنی، کتاب سوزی اور کھلی نفرت ایسے طریقے ہیں جن سے کوئی قوم اپنے کھوئے ہوئے وقار کو بحال کر سکتی ہے۔ یہاں آ کر دستاویزی فلمساز کو صاف نظر آ جاتا کہ سرکار کے دونوں بازو کس طرح ایک ہم آہنگی میں حرکت کر رہے ہیں۔ ان دونوں بازوؤں نے ایک قینچی کی سی حرکت کو مشق کے ذریعے کس طرح پکا کر لیا ہے — ایک بازو قوم کو پارچہ پارچہ کر کے بیچنے میں مشغول ہے، جبکہ دوسرا بازو، توجہ ہٹانے کے لیے، ثقافتی قوم پرستی کے ایک چیختے چنگھاڑتے، فاتر العقل کورس کی اگوائی کر رہا ہے۔ اس عمل کو سچ مچ اپنی آنکھ سے دیکھنا نہایت متاثر کن ہوگا کہ کس طرح قینچی کے ایک پھل کی سنگدل سفاکی، دوسرے پھل کی تنگی، فحش دہشت پسندی کو جنم دیتی ہے۔ آڈوانی اور اینڈی — یہ دونوں سیاسی توام ہیں۔ ان کے کئی اعضا مشترک ہیں۔ انھیں یہ مہارت حاصل ہے کہ دو باتیں، ایک دوسرے سے قطعی متضاد، بیک وقت کہہ سکیں، مختلف وقت پر مختلف موقف اختیار کر سکیں۔ ان دونوں کو

ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔

تیسرا مقام جہاں میں نے اس فلسفاز کو لے جانا چاہا، زمداوادی تھی جہاں وہ ایک پُرجوش، جادوئی، شاندار، سخت جان اور سب سے بڑھ کر غیر متشدد مزاحمت کا مشاہدہ کرسکے جو اس حسین دریا کے کناروں پر پروان چڑھی ہے۔

ہماری دنیا کے ساتھ جو کچھ پیش آ رہا ہے وہ اس قدر عظیم الجثہ ہے کہ انسانی فہم کے اندر سما نہیں سکتا۔ لیکن یہ ایک بہت، بہت دہشت ناک چیز ہے۔ اس کے محیط اور پھیلاؤ کا اندازہ کرنا، اس کی تعریف متعین کرنے کی کوشش کرنا، اس سے لڑنے کی کوشش کرنا ناممکن ہے۔ اس کا مقابلہ کرنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ مقامی، مخصوص لڑائیاں مخصوص طریقوں سے لڑی جائیں۔ زمداوادی اس جنگ کا ایک اچھا نقطۂ آغاز ہوسکتی ہے۔ موجودہ حالات میں اگر کوئی شے واقعی گلوبلائز کیے جانے کی مستحق ہے تو وہ یہی اختلاف کا جذبہ ہے۔ متبادل طریقوں سے لیس، تخیل کی پوری مدد سے کیا جانے والا اختلاف۔ یہ آپ کو زمداوادی میں ملے گا۔ اس کی سرحدیں کھلی ہیں۔ اندر آ جائیے۔ ہم سب مل کر رہپل سلٹسکن کو دفن کردیں گے۔

❁❁

سامراج کا مقابلہ

مجھ سے جس موضوع پر بولنے کے لیے کہا گیا ہے وہ ہے: "سامراج کا مقابلہ کیسے کیا جائے؟" یہ ایک بہت بڑا سوال ہے، اور میرے پاس اس کے آسان جواب موجود نہیں ہیں۔

جب ہم "سامراج" کا مقابلہ کرنے کی بات کرتے ہیں، تو ہمیں یہ جاننے کی ضرورت پڑتی ہے کہ "سامراج" کا مطلب کیا ہے۔ کیا اس سے مراد امریکی حکومت (اور اس کے یوروپی طفیلی سیارے)، ورلڈ بینک، انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ، ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن اور ملٹی نیشنل کارپوریشنیں ہیں؟ یا اس سے مراد ان سب سے وسیع کوئی چیز ہے؟

بہت سے ملکوں میں سامراج نے اپنے ذیلی سر ابھارے ہیں، کچھ ایسی چیزوں کو جنم دیا ہے جو اس کی خطرناک ضمنی پیداوار ہیں — قوم پرستی مذہبی جنون، فسطائیت اور، بلاشبہ، دہشت گردی۔ اور یہ سب کارپوریٹ گلوبلائزیشن کے بازو میں بازو ڈال کر آگے بڑھ رہے ہیں۔

میں اپنی بات کو ایک مثال سے واضح کرنا چاہتی ہوں۔ ہندوستان — دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت — اس وقت کارپوریٹ گلوبلائزیشن کے منصوبے میں سب سے پیش پیش ہے۔ اس کے ایک ارب باشندوں پر مشتمل "منڈی" کو ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن دنیا کے لیے کھولنے کی کوشش میں ہے۔ ہندوستانی حکومت اور حکمران طبقہ کارپوریٹائزیشن اور پرائیویٹائزیشن کو خوش آمدید کہہ رہا ہے۔

---

27 جنوری 2003 کو برازیل کے شہر پورتو الیگرے میں ایک اجتماع سے خطاب۔

یہ ہرگز کوئی اتفاق نہیں ہے کہ ہندوستان کا وزیر اعظم، وزیر داخلہ، اور ڈس انوسٹمنٹ کا وزیر —جو سب کے سب وہ لوگ ہیں جنھوں نے انرون کمپنی کے ہندوستان کے ساتھ معاہدوں پر دستخط کیے تھے، جو ملک کے ترقیاتی ڈھانچے کو ملٹی نیشنل کارپوریشنوں کے ہاتھ بیچ رہے ہیں، اور جو پانی، بجلی، تیل، کوئلے، فولاد، صحت، تعلیم اور مواصلات کو پرائیویٹائز کرنا چاہتے ہیں — راشٹریہ سویم سیوک سنگھ یعنی آر ایس ایس کے رکن یا حامی ہیں۔ آر ایس ایس ایک دائیں بازو کی، انتہائی قوم پرست، ہندو تنظیم ہے جس نے ہٹلر اور اس کے اختیار کردہ طریقوں کو کھلے بندوں سراہا تھا۔

ہندوستان میں جمہوریت کا انہدام سٹرکچرل ایڈجسٹمنٹ پروگرام کی سی تیز رفتاری اور اثر انگیزی کے ساتھ ہو رہا ہے۔ ٹھیک اس وقت جب کارپوریٹ گلوبلائزیشن کا منصوبہ ہندوستان کے لوگوں کی زندگیوں کو تار تار کر رہا ہے، بڑے پیمانے پر کی جانے والی پرائیویٹائزیشن اور مزدور "اصلاحات" کے ہاتھوں لوگ اپنی زمین سے بے دخل اور روزگار سے محروم کیے جا رہے ہیں۔ مفلسی کا شکار ہونے والے سینکڑوں کسان کیڑے مار دوائیں پی کر خودکشی کر رہے ہیں۔ لوگوں کے بھوک سے مرنے کی خبریں ملک کے ہر حصے سے آ رہی ہیں۔

جس وقت حکمران طبقہ اپنی مفروضہ منزل کی طرف، جو دنیا کے بلند ترین مقام کے آس پاس کہیں واقع ہے، رواں دواں ہے، غریب لوگ، جن سے سب کچھ چھین لیا گیا ہے، چکراتے ہوئے نیچے جرم اور انتشار کی گہرائی میں گرتے جا رہے ہیں۔ احساسِ محرومی اور قومی ناامیدی کا یہ ماحول، تاریخ ہمیں بتاتی ہے، فسطائیت کے لیے نہایت زرخیز زمین فراہم کرتا ہے۔

ہندوستانی حکومت کے دونوں بازو بڑی مہارت سے قینچی کے دو پھلوں جیسی حرکت میں مشغول ہیں۔ ایک بازو ملک کو پارہ پارہ کر کے فروخت کر رہا ہے، تو دوسرا بازو، اس کی طرف سے توجہ ہٹانے کے لیے، ہندو قوم پرستی اور مذہبی فسطائیت کا ایک ہونکتا ہوا، کان پھاڑ دینے والا شور برپا کرنے میں مصروف ہے۔ یہ بازو نیوکلیئر تجربات کر رہا ہے، تاریخ کی کتابوں کو نئے سرے سے اور مسخ انداز میں لکھ رہا ہے، گرجا گھروں کو آگ لگا رہا ہے اور مسجدوں کو مسمار کر رہا ہے۔ سنسر شپ، عام نگرانی، شہری آزادیوں کی معطلی، ہندوستانی شہریت کی (خاص طور پر ہندوستان کی مذہبی اقلیتوں کے لیے) ایک نئی تعریف وضع کرنا، اب معمول کی سرگرمی ہے۔

پچھلے سال مارچ میں ہندوستانی ریاست گجرات میں دو ہزار مسلمان ریاستی حکومت کی زیرنگرانی کرائے جانے والے ایک پوگروم میں ہلاک کر دیے گئے۔ مسلمان عورتوں کو خاص طور پر نشانہ بنایا گیا۔ انھیں ننگا کیا گیا، ان کے ساتھ اجتماعی زنا بالجبر کیا گیا، اور اس کے بعد انھیں زندہ جلا دیا گیا۔ حملہ آوروں نے دکانوں، گھروں، ٹیکسٹائل ملوں اور مسجدوں کو لوٹا اور جلایا۔ ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ مسلمانوں کو ان کے گھروں سے بے دخل کر دیا گیا۔ مسلمان آبادی کی اقتصادی بنیادوں کو تباہ کر دیا گیا۔

جس وقت گجرات جل رہا تھا، ہندوستانی وزیر اعظم ایم ٹی وی پر اپنی تازہ نظموں کی تشہیر میں مصروف تھا۔ اس سال جنوری میں اس قتل عام کی ذمے دار حکومت انتخابات جیت کر محفوظ اکثریت کے ساتھ دوبارہ اقتدار میں آ گئی۔ نسل کشی کے لیے کسی شخص کو کوئی سزا نہیں دی گئی۔ نریندر مودی، جو اس پوگرام کا منصوبہ ساز اور آر ایس ایس کا پُرغرور رکن ہے، گجرات کے وزیر اعلیٰ کے عہدے پر ایک اور میعاد کے لیے فائز ہو گیا۔ اگر وہ صدام حسین ہوتا تو بلاشبہ اس کی ہر سفاکی کی خبر سی این این پر تفصیل سے نشر کی جاتی۔ لیکن چونکہ وہ صدام حسین نہیں ہے — اور چونکہ ہندوستانی ''منڈی'' بین الاقوامی سرمایہ کاروں کے لیے کھلی ہوئی ہے — اس لیے یہ قتل عام کسی معمولی سی شرمندگی کا بھی سبب نہیں بنا۔

ہندوستان میں مسلمان شہریوں کی تعداد دس کروڑ سے زیادہ ہے۔ ہماری قدیم سرزمین میں اس وقت ایک ٹائم بم ٹک ٹک کر رہا ہے۔

یہ سب بیان کرنے کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ یہ ایک غلط مفروضہ ہے کہ کھلی منڈی کی معیشت قومی سرحدوں کو مسمار کر دیتی ہے۔ کھلی منڈی قومی خودمختاری کو ہرگز خطرے میں نہیں ڈالتی؛ وہ جمہوریت کو نیست و نابود کر دیتی ہے۔

جوں جوں امیر اور غریب کے درمیان فرق بڑھ رہا ہے، وسائل کو اپنے لیے محفوظ کرنے کی جنگ میں بھی شدت آتی جا رہی ہے۔ اپنے محبوب سودوں کو آگے بڑھانے کے لیے، جو فصلیں ہم اُگاتے ہیں، جو پانی ہم پیتے ہیں، جس ہوا میں ہم سانس لیتے ہیں، اور جو خواب ہم دیکھتے ہیں، ان سب کو کارپوریٹ اداروں کے قبضے میں دینے کے لیے، کارپوریٹ گلوبلائزیشن کو غریب ملکوں میں

وفادار، بدعنوان، آمرانہ حکومتوں کے ایک بین الاقوامی اتحاد کی ضرورت ہے جو عوام میں غیر مقبول ''اصلاحات'' نافذ کر سکیں اور ان کے نتیجے میں اٹھنے والی بغاوتوں کو کچل سکیں۔ کارپوریٹ گلوبلائزیشن کو --- یا ہم اسے اس کے اصل نام سے کیوں نہ پکاریں --- سامراج کو ایک ایسے پریس کی ضرورت ہے جو آزاد ہونے کا ڈھونگ رچا سکے، ایسی عدالتوں کی ضرورت ہے جو انصاف کی فراہمی کا ناٹک کر سکیں۔

دریں اثنا، شمال سے تعلق رکھنے والے ملک اپنی سرحدوں کو سخت کر رہے ہیں اور عام تباہی والے ہتھیاروں کے ڈھیر لگا رہے ہیں۔ آخر انھیں اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ صرف دولت، اشیاء، پیٹینٹ، اور خدمات کی ہی گلوبلائزیشن ہو۔ کہیں لوگوں کی دنیا میں آزادانہ آمدورفت شروع نہ ہو جائے۔ کہیں انسانی حقوق کی گلوبلائزیشن نہ ہو جائے۔ کہیں نسلی امتیاز کے خلاف معاہدوں کی، یا کیمیائی یا نیوکلیئر ہتھیاروں پر پابندی کے معاہدوں کی، یا گرین ہاؤس اثرات یا موسمی تبدیلیاں پیدا کرنے والے بخارات کے خلاف معاہدوں کی گلوبلائزیشن نہ ہو جائے، اور کہیں --- خدانخواستہ --- انصاف کی گلوبلائزیشن نہ ہو جائے۔

سو یہ --- یہ سب کچھ --- سامراج ہے۔ وفادار بدعنوان حکومتوں کا یہ اتحاد، طاقت کا یہ فحش ارتکاز، فیصلہ کرنے والوں اور ان فیصلوں کا شکار ہونے والوں کے درمیان یہ بڑھتا ہوا فاصلہ۔

ہماری لڑائی، ہماری منزل، ایک مختلف دنیا کا ہمارا تصور اس نکتے پر مرکوز ہونا چاہیے کہ اس فاصلے کو ختم کر دیا جائے۔

سو ہم سامراج کی مزاحمت کس طرح کر سکتے ہیں؟

اچھی خبر یہ ہے کہ ہم اچھا خاصا لڑ رہے ہیں۔ بہت سی بڑی بڑی فتوحات پیش آئی ہیں۔ یہاں لاطینی امریکہ میں آپ لوگوں کے حصے میں کئی فتوحات آئی ہیں --- بولیویا میں آپ کو کوچابامبا میں فتح حاصل ہوئی، پیرو میں اریکویپا میں عوامی مزاحمت ہوئی ہے، وینیزویلا میں صدر ہیوگو شاویز کو امریکی حکومت سخت کوششوں کے باوجود ہٹا نہیں سکی ہے۔

اور اب دنیا کی نظریں ارجنٹینا کے لوگوں پر جمی ہوئی ہیں جو آئی ایم ایف کی لائی ہوئی تباہی کے ملبے سے اپنے ملک کو نئے سرے سے تخلیق کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ہندوستان میں کارپوریٹ گلوبلائزیشن کے خلاف تحریک کا زور بڑھ رہا ہے اور وہ ملک کی واحد سیاسی قوت بننے کے عمل میں ہے، جو مذہبی فسطائیت کا مقابلہ کر سکے گی۔

جہاں تک کارپوریٹ گلوبلائزیشن کے چمکتے ہوئے سفیروں کا تعلق ہے — انرون، بیکٹیل، ورلڈکوم، آرتھر اینڈرسن — یہ سب کمپنیاں پچھلے سال کہاں تھیں، اور آج کہاں ہیں؟

اور بلاشبہ برازیل میں ہمیں سوال کرنا چاہیے: پچھلے سال یہاں کا صدر کون تھا، اور آج کون ہے؟

اس کے باوجود، ہم میں سے بہت سوں کو نا امیدی اور مایوسی کے تاریک لمحوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے پردے کی آڑ میں سوٹ پہنے ہوئے لوگ اپنے کام میں پوری شدت سے لگے ہوئے ہیں۔

جب ہم پر بموں کی بارش کی جاتی ہے، جب کروز میزائل آسمانوں کو چیرتے ہوئے گزرتے ہیں، ہم جانتے ہیں کہ اسی وقت تجارتی معاہدوں پر دستخط کیے جا رہے ہیں، پیٹنٹ رجسٹر ہو رہے ہیں، تیل کی پائپ لائنیں بچھائی جا رہی ہیں، قدرتی وسائل کو لوٹا جا رہا ہے، پانی کو پرائیویٹائز کیا جا رہا ہے، اور جارج بش عراق پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا ہے۔

اگر ہم اس مزاحمت کو سامراج اور اس کے مخالفوں کے درمیان ایک دوبدو مقابلے کی شکل میں دیکھیں تو ایسا ظاہر ہو سکتا ہے کہ ہم ہار رہے ہیں۔

لیکن اسے دیکھنے کا ایک اور طریقہ بھی ہے۔ ہم نے، ہم سب نے جو یہاں جمع ہیں، ہم میں سے ہر ایک نے، اپنے اپنے منفرد طریقے سے، سامراج کا گھیراؤ کر رکھا ہے۔

خواہ ہم اس کا راستہ روکنے میں — اب تک — کامیاب نہ ہوئے ہوں، لیکن ہم نے اسے عریاں ضرور کر دیا ہے۔ ہم نے اسے اپنا نقاب اتارنے پر ضرور مجبور کر دیا ہے۔ اب وہ ہم سب کے سامنے دنیا کے سٹیج پر اپنی مکمل وحشیانہ، بے انصاف برہنگی میں کھڑا ہے۔

سامراج جنگ ضرور شروع کر سکتا ہے، لیکن اب خود کو اپنی مرضی کا غلاف نہیں پہنا سکتا — اب وہ خود بھی اپنی بدصورت برہنگی کا سامنا نہیں کر سکتا۔ اب وہ اپنے ملک کے لوگوں کو اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔ اب یہ زیادہ دیر کی بات نہیں کہ امریکہ کے عام لوگ ہمارے اتحادی ہوں گے۔

صرف چند روز پہلے واشنگٹن میں ڈھائی لاکھ افراد نے عراق پر جنگ مسلط کرنے کے خلاف مارچ کیا۔ اس احتجاج میں ماہ بہ ماہ شدت آرہی ہے۔

نائن الیون سے پہلے امریکہ کی ایک خفیہ تاریخ تھی۔ وہ تاریخ جسے خاص طور پر اس کے اپنے شہریوں سے راز میں رکھا جاتا تھا۔ لیکن اب امریکی رازداری تاریخ کا حصہ بن چکی ہے، اور امریکی تاریخ عام لوگوں کے علم کا۔ اب اس پر گلیوں میں بحث ہوتی ہے۔

آج ہم جانتے ہیں کہ عراق کے خلاف جنگ میں شدت لانے کے لیے دی جانے والی ہر دلیل جھوٹی ہے۔ اور سب سے بڑی جھوٹی دلیل یہ ہے کہ امریکی حکومت عراق میں جمہوریت لانا چاہتی ہے۔

لوگوں کو آمریت یا نظریاتی بے راہ روی سے محفوظ رکھنے کے لیے انھیں قتل کرنا بلا شبہ ایک پرانا امریکی کھیل ہے۔ یہاں لاطینی امریکہ میں آپ لوگ اس بات کا بیشتر لوگوں سے زیادہ اچھی طرح علم رکھتے ہیں۔

کسی کو اس بات پر شبہ نہیں کہ صدام حسین ایک ظالم ڈکٹیٹر اور قاتل ہے (جس کے بدترین مظالم امریکہ اور برطانیہ کی حکومتوں کی حمایت سے سرانجام دیے گئے تھے)۔ اس بات میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ عراقی عوام صدام حسین سے نجات پا کر بہتر صورت حال میں ہوں گے۔

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ جارج بش نامی ایک شخص سے نجات پا کر پوری دنیا خود کو بہتر حالت میں محسوس کرے گی۔ درحقیقت وہ صدام حسین سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔

تو کیا ہمیں وائٹ ہاؤس پر بمباری کر کے بش کو وہاں سے نکال باہر کرنا چاہیے؟

یہ بات انتہائی واضح ہے کہ بش عراق کے خلاف جنگ کرنے پر تلا ہوا ہے اور اس سلسلے میں تمام حقائق کو — اور بین الاقوامی رائے عامہ کو — نظر انداز کر دینے پر آمادہ ہے۔

اتحادیوں کو بھرتی کرنے کی مہم میں امریکہ نئے حقائق ایجاد کرنے کو بھی تیار ہے۔

ہتھیاروں کے معائنہ کاروں کا رچایا ہوا ڈھونگ ایک امریکی کھیل ہے، بین الاقوامی ایٹی کیٹ کی ایک مسخ شدہ شکل کی تحقیر آمیز انداز میں پابندی کرنے کی ایک کوشش۔ یہ کوشش ایک چھوٹے دروازے کو کھلا چھوڑنے کے مترادف ہے جس میں آخری لمحے میں ساتھ دینے کا فیصلہ کرنے

والا کوئی اتحادی، یا خود اقوامِ متحدہ، رینگ کر اندر آ سکے۔

لیکن عملی طور پر عراق کے خلاف جنگ شروع ہو چکی ہے۔

ہم کیا کر سکتے ہیں؟

ہم اپنی یادداشت کو جلا دے سکتے ہیں، اپنی تاریخ سے سبق سیکھ سکتے ہیں۔ ہم رائے عامہ کو تعمیر کرنے کا عمل جاری رکھ سکتے ہیں، یہاں تک کہ وہ ایک ناقابلِ برداشت شور میں بدل جائے۔

ہم عراق کے خلاف جنگ کو امریکی حکومت کے مظالم کا پردہ فاش کرنے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔

ہم جارج بش اور ٹونی بلیئر (اور ان کے اتحادیوں) کی اصل حقیقت کو — کہ یہ بچوں کے قاتل، پانی کو زہریلا کرنے والے، اور بزدلی کے ساتھ دور بیٹھ کر بمباری کرنے والے ہیں — آشکار کر سکتے ہیں۔

ہم سول نافرمانی کو اس کی لاتعداد شکلوں میں نئے سرے سے ایجاد کر سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم ایسے لاتعداد طریقے اختیار کر سکتے ہیں جو ہمیں سامراج کے لیے ایک اجتماعی، ناقابلِ برداشت مصیبت میں تبدیل کر دیں۔

جب جارج بش کہے کہ ''یا تو تم ہمارے ساتھ ہو یا پھر دہشت گردوں کے،'' تو ہم اس کو جواب دے سکتے ہیں کہ ''جی نہیں، شکریہ!'' ہم اسے بتا سکتے ہیں کہ دنیا کے لوگوں کو ایک شرانگیز مکی ماؤز اور پاگل ملاؤں کے درمیان انتخاب کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

ہماری حکمتِ عملی صرف سامراج کا مقابلہ کرنے کی نہیں بلکہ اس کا گھیراؤ کرنے کی ہونی چاہیے۔ ہمیں اس کو آکسیجن سے محروم کر دینا چاہیے۔ اسے شرمندہ کرنا چاہیے۔ اس کا منھ چڑانا چاہیے۔ اپنے آرٹ، اپنی موسیقی، اپنے ادب کے ذریعے، اپنی ضد، اپنی ذہانت، اپنے عزم کے ذریعے، اور اپنی کہانیاں ایجاد کرنے کی اہلیت کے ذریعے۔ ایسی کہانیاں جو ان کہانیوں سے مختلف ہوں جن پر ہمیں برین واشنگ کے زور پر یقین کرنا سکھایا جا رہا ہے۔

کارپوریٹ انقلاب ناکام ہو جائے گا اگر ہم اس کا تیار کردہ مال خریدنے سے انکار کر دیں — یعنی اس کے خیالات، اس کی وضع کردہ تاریخ، اس کی جنگیں، اس کے ہتھیار، اپنی ناگزیریت کے

بارے میں اس کا گمان۔

یہ بات یاد رکھیے: ہم تعداد میں زیادہ ہیں اور وہ تعداد میں کم ہیں۔ ہمیں ان کی جتنی ضرورت ہے اس سے کہیں زیادہ انھیں ہماری ضرورت ہے۔

ایک مختلف دنیا محض ممکن نہیں، بلکہ وجود میں آنے کے عمل میں ہے۔ کسی خاموش دن، میں اس کے سانس لینے کی آواز تک سن سکتی ہوں۔

❀❀

لامتناہی انصاف کا حساب کتاب

گیارہ ستمبر 2001 کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹا گون پر ہونے والے ناقابلِ مدافعت خودکش حملوں کے بعد ایک امریکی نیوز کاسٹر نے کہا: ''نیکی اور بدی شاذ و نادر ہی خود کو اتنے واضح طور پر ظاہر کرتے ہیں جیسا پچھلے منگل کے دن ہوا۔ ایسے لوگوں نے جنھیں ہم نہیں جانتے، اُن لوگوں کو قتل کیا جنھیں ہم جانتے ہیں۔ اور انھوں نے یہ سب ایک تحقیر آمیز مسرت کے ساتھ کیا۔'' اس کے بعد وہ جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور رونے لگا۔

اصل نکتہ اسی بات میں پوشیدہ ہے: امریکہ ایسے لوگوں کے خلاف جنگ کر رہا ہے جنھیں وہ نہیں جانتا، کیونکہ وہ لوگ عموماً ٹی وی سکرینوں پر نمودار نہیں ہوتے۔ اپنے دشمن کو مناسب طور سے شناخت کرنے اور اس کی فطرت کو سمجھنے کی کوشش شروع کیے بغیر امریکی حکومت نے، پبلسٹی اور کھوکھلی، شرمندہ کن خطابت کے شور و غل کے درمیان، ''دہشت گردی کے خلاف ایک بین الاقوامی اتحاد'' قائم کر لیا، اپنی زمینی، ہوائی، اور بحری فوج کو اور ذرائع ابلاغ کو متحرک کر لیا، اور ان سب کو جنگ پر آمادہ کر لیا۔

مسئلہ یہ ہے کہ امریکہ جب ایک بار جنگ کے ارادے سے نکل کھڑا ہوتا ہے تو پھر جنگ کیے بغیر واپس نہیں لوٹ سکتا۔ اگر وہ اپنے دشمن کو تلاش نہ کر سکے تو وطن میں بیٹھے مشتعل لوگوں کی خاطر، اسے اپنا دشمن گھڑنا پڑتا ہے۔ ایک بار جنگ شروع ہو جائے تو وہ اپنی حرکیات، اپنی منطق اور اپنا جواز خود پیدا کر لیتی ہے، اور بہت جلد ہماری نظروں سے یہ بات اوجھل ہو جاتی ہے کہ یہ جنگ دراصل شروع کس لیے ہوئی تھی۔ اس وقت ہم جس منظر کا مشاہدہ کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ دنیا کا طاقتور ترین

ملک، غصے سے بے اختیار ہو کر، خود کو ایک نئی قسم کی جنگ لڑنے کی نہایت قدیم جبلت کے سپرد کر رہا ہے۔ اِس وقت جب اسے اپنی حفاظت کا مسئلہ درپیش ہوا ہے تو تمام روایتی وارشپ، کروز میزائل، اور ایف سولہ طیارے اچانک گئی گزری، فرسودہ اشیا معلوم ہونے لگے ہیں۔ حملے سے باز رکھنے کی ضمانت کے طور پر امریکہ کے ایٹمی ہتھیاروں کے ذخیرے کی حیثیت ہم وزن کباڑ سے زیادہ کی نہیں رہ گئی۔ ڈبے کھولنے والے کٹر، قلمی چاقو اور سرد غصہ وہ ہتھیار ہیں جن سے نئی صدی کی جنگیں لڑی جائیں گی۔ غصہ تار کا ایک ٹکڑا ہے۔ وہ کسی کو دکھائی دیے بغیر کسٹم سے گزر جاتا ہے۔ سامان کی تلاشی میں کسی کو نظر نہیں آتا۔

امریکہ کس سے لڑ رہا ہے؟ 20 ستمبر کو ایف بی آئی نے کہا کہ اسے ہائی جیکروں میں سے بعض کی شناخت کے بارے میں شبہات ہیں۔ ٹھیک اسی دن صدر بش نے کہا، ''ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ کون لوگ ہیں اور کن ملکوں کی حکومتیں ان کی اعانت کر رہی ہیں۔'' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صدر کو کچھ ایسی چیزیں بھی معلوم ہیں جو ایف بی آئی اور امریکی عوام کے علم سے باہر ہیں۔

20 ستمبر کو امریکی کانگریس سے خطاب کرتے ہوئے صدر بش نے امریکہ کے دشمنوں کو ''آزادی کے دشمن'' قرار دیا۔ ''امریکی پوچھتے ہیں: وہ ہم سے کیوں نفرت کرتے ہیں؟ دراصل وہ ہماری آزادی سے نفرت کرتے ہیں، ہماری مذہبی آزادی سے، ووٹ دینے، ایک دوسرے کے ساتھ اکٹھا ہونے اور ایک دوسرے سے اختلاف کرنے کی آزادی سے۔'' یہاں لوگوں سے سلسلہ وار دو باتوں پر آنکھیں بند کر کے یقین کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ ایک تو یہ کہ ''دشمن'' وہی ہے جسے امریکی حکومت دشمن قرار دے رہی ہے، حالانکہ اس کے پاس اس کی کوئی شہادت موجود نہیں ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ اس دشمن کے عمل کے محرکات وہی ہیں جنھیں امریکی حکومت ان کے محرکات کے طور پر بیان کر رہی ہے، اور اس کے پاس اس کی بھی کوئی شہادت موجود نہیں ہے۔

سٹریٹیجک، فوجی اور اقتصادی وجوہ سے یہ امریکی حکومت کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ اپنے عوام کو یہ باور کرائے کہ آزادی، جمہوریت اور امریکی طرزِ زندگی سے ان کی وابستگی خطرے کی زد میں ہے۔ صدمے، غم اور غصے کے موجودہ ماحول میں اس تصور کو مقبول بنانا آسان کام ہے۔ تاہم، اگر یہ تصور حقیقت پر مبنی ہوتا تو یہ بات سمجھنا سخت دشوار ہے کہ حملے کے لیے امریکہ کی اقتصادی اور فوجی

بالا دستی کی علامات، یعنی ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹا گون، کو کیوں منتخب کیا گیا۔ ان کے بجائے مجسمۂ آزادی پر حملہ کیوں نہ کیا گیا؟ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ حملے کا محرک امریکی آزادی اور جمہوریت نہیں بلکہ وہ تاریخی حقائق ہوں جن کی رو سے امریکہ نے ہمیشہ (امریکہ سے باہر) آزادی اور جمہوریت کی عین ضد — یعنی فوجی اور معاشی دہشت گردی، انتشار، فوجی آمریت، مذہبی شدت پسندی اور ناقابلِ تصور نسل کشی — کی عملی طور پر حمایت کی ہے؟ امریکی عوام کے لیے، جو ابھی ابھی اتنے بڑے صدمے سے دوچار ہوئے ہیں، بلاشبہ اس بات کا سامنا کرنا بہت دشوار ہے کہ وہ اپنی آنسو بھری آنکھیں دنیا کی طرف اٹھائیں اور انھیں دنیا کی آنکھوں میں 'بے اعتنائی' دکھائی دے۔ یہ بے اعتنائی نہیں ہے۔ یہ محض تعجب کی غیر موجودگی ہے۔ اس بات کا گھسا پٹا شعور ہے کہ جو کچھ دوسروں کے ساتھ کیا جاتا ہے وہ بالآخر اپنے ساتھ بھی پیش آتا ہے۔ امریکی عوام کو یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ نفرت کا ہدف وہ نہیں بلکہ ان کی حکومت کی پالیسیاں ہیں۔ ان کو اس بات پر ذرا بھی شبہ نہیں ہو سکتا کہ ان کے غیر معمولی موسیقاروں، ادیبوں، اداکاروں، ان کے شاندار کھلاڑیوں اور ان کی فلموں کو دنیا بھر میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے۔ گیارہ ستمبر کے حملوں کے بعد ان کے آگ بجھانے والوں، جان بچانے والوں اور عام سرکاری اہلکاروں نے جس حوصلے اور وقار کے ساتھ اپنا فرض انجام دیا اس سے ہم سب متاثر ہوئے ہیں۔

جو کچھ ہوا اس پر امریکہ کا صدمہ بے پناہ ہے، اور بے پناہ طور پر واضح ہے۔ یہ توقع کرنا بھونڈی بات ہوگی کہ وہ اپنے صدمے کو دوسروں کے صدموں سے ملا کر دیکھنے یا اس کی شدت کو دھیما کرنے کی کوشش کرے۔ تاہم یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہوگی کہ امریکہ اس غمناک موقعے کو یہ جاننے کی کوشش کرنے کے بجائے کہ گیارہ ستمبر کے واقعات کیوں رونما ہوئے، اس مقصد کے لیے استعمال کرے کہ دنیا بھر کے لوگوں کا غم اور غصہ صرف ہلاک ہونے والے امریکی شہریوں کا ماتم کرنے اور ان کی ہلاکت کا انتقام لینے کے لیے وقف کر دیا جائے۔ کیونکہ ایسی صورت میں دشوار سوالات پوچھنے اور تلخ باتیں کہنے کی ذمے داری باقی لوگوں پر، یعنی ہم پر، آ پڑے گی۔ اور اس تمام کوشش، اور غلط موقعے پر کہی جانی والی باتوں کے لیے ہمیں ناپسند کیا جائے گا، نظر انداز کیا جائے گا اور آخرکار خاموش کرا دیا جائے گا۔

دنیا کو شاید یہ بات کبھی معلوم نہ ہو پائے کہ ان ہائی جیکروں کو جنھوں نے اُن مخصوص مسافر طیاروں کو اغوا کر کے اُن مخصوص امریکی عمارتوں سے ٹکرا دیا، اس عمل پر کس بات نے مجبور کیا تھا۔ وہ شہرت کے خواہشمند نوجوان نہیں تھے۔ انھوں نے اپنے پیچھے خودکشی کے رقعے یا سیاسی پیغامات نہیں چھوڑے۔ کسی تنظیم نے ان حملوں کا ذمے دار ہونے کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ اپنے عمل پر ان کے اعتقاد نے زندہ رہنے کی فطری انسانی جبلّت پر، اور یاد رکھے جانے کی خواہش پر بھی، غلبہ پا لیا تھا۔ شاید ایسا تھا کہ وہ اپنے غصے کی شدت کو اپنے کیے ہوئے اس عمل سے کمتر کسی چیز کے ساتھ جوڑ کر ہلکا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اور ان کے اس عمل نے دنیا میں، جیسا کہ ہم اسے جانتے تھے، ایک بہت بڑی دراڑ پیدا کر دی ہے۔ درست معلومات کی عدم موجودگی میں سیاست داں، سیاسی مبصر اور مضمون نگار (مثلاً میں) اس عمل میں خود اپنے سیاسی تصورات، اپنی تعبیرات شامل کریں گے۔ یہ قیاس آرائی، اور جس سیاسی فضا میں یہ واقعات پیش آئے اس کا تجزیہ، محض ایک اچھی چیز ہی ہو سکتی ہے۔

لیکن دنیا پر جنگ کے بادل چھا رہے ہیں۔ جو کچھ کہنے کو باقی ہے اسے جلدی سے کہہ دیا جانا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ امریکہ خود کو "دہشت گردی کے خلاف اتحاد" کی قیادت پر فائز کر لے، اس سے پہلے کہ وہ دوسرے ملکوں کو آمادہ (اور مجبور) کرے کہ وہ اس کے تقریباً خدائی منصوبے — یعنی آپریشن لامتناہی انصاف — میں عملی طور پر شامل ہو جائیں (اس نام پر یہ اعتراض ہوا کہ مسلمان اسے اپنی ہتک تصور کریں گے کیونکہ ان کے نزدیک لامتناہی انصاف صرف اللہ کے لیے مخصوص ہے، اور اس اعتراض کے پیشِ نظر اس کا نام بدل کر پائیدار آزادی کر دیا گیا)، اس سے پہلے کچھ باتوں کی وضاحت کر دینا ضروری ہے۔ مثلاً لامتناہی انصاف یا پائیدار آزادی کس کے لیے؟ کیا امریکہ کی یہ جنگ امریکہ میں ہونے والی دہشت گردی کے خلاف ہے یا عام طور پر ہر دہشت گردی کے خلاف؟ اس کے ذریعے دراصل کس شے کا انتقام لیا جا رہا ہے؟ تقریباً سات ہزار جانوں کے ضیاع، مین ہیٹن میں واقع پچیس لاکھ مربع فٹ دفتری رقبے کی تباہی، پینٹاگون کے ایک حصے کے انہدام، کئی لاکھ ملازمتوں کے اختتام، بعض ایرلائن کمپنیوں کے دیوالے اور نیویارک سٹاک ایکسچینج میں آنے والی گراوٹ کا؟ یا یہ اس تمام نقصان سے بڑی کوئی چیز ہے؟ 1996 میں میڈلین آلبرائٹ سے، جو اس

وقت امریکی وزیر خارجہ تھی، قومی ٹیلیوژن پر یہ سوال کیا گیا تھا کہ جو پانچ لاکھ عراقی بچے امریکہ کی جانب سے لگائی گئی اقتصادی پابندیوں کے نتیجے میں ہلاک ہوئے ہیں ان کے بارے میں وہ کیا محسوس کرتی ہے۔ اس نے جواب دیا کہ یہ ایک بے حد دشوار انتخاب ہے، لیکن ساری چیزوں کو مدنظر رکھتے ہوئے، اس کا خیال ہے کہ یہ امریکی مقاصد کے حصول کی مناسب قیمت ہے۔ یہ جواب دینے پر البرائٹ کو اس کی ملازمت سے برطرف نہیں کیا گیا۔ وہ امریکی حکومت کے خیالات اور احساسات کی نمائندگی کرتے ہوئے بدستور دنیا بھر کے دورے کرتی رہی۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ عراق پر لگائی گئی پابندیاں بدستور برقرار رہیں۔ بچے اب بھی ہلاک ہو رہے ہیں۔

تو یہ بات ہمارے سامنے ہے۔ تہذیب یافتہ اور وحشی دنیا کا مبہم فرق، بے گناہ لوگوں کی ہلاکت اور "تہذیبوں کے تصادم" اور ناگزیر ہلاکتوں کا فرق۔ لامتناہی انصاف کا باریک بین اور رعونت آمیز حساب کتاب۔ دنیا کو ایک بہتر جگہ بنانے کے لیے کتنے عراقیوں کو ہلاک کرنے کی ضرورت ہوگی؟ ہلاک ہونے والے ایک انوسٹمنٹ بینکر کے بدلے میں مجاہدین کی کتنی جانیں درکار ہوں گی؟ ہم سحر زدہ آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور دنیا بھر کے ٹی وی سکرینوں پر آپریشن پائیدار آزادی اپنے طے شدہ راستے پر آگے بڑھ رہا ہے۔ دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں کا اتحاد دنیا کے ایک غریب ترین، تباہ شدہ اور جنگ کے نتیجے میں بدحال ملک افغانستان کے گرد گھیرا تنگ کر رہا ہے، جس میں قائم طالبان کی حکومت اسامہ بن لادن کو پناہ دیئے ہوئے ہے، یعنی اُس شخص کو جسے گیارہ ستمبر کے حملوں کے لیے ذمے دار قرار دیا جا رہا ہے۔

افغانستان میں اگر کوئی شے اب بھی تباہ کیے جانے کے لیے دستیاب ہے تو وہ اس کے باقی ماندہ شہری ہیں، جن میں پانچ لاکھ کی تعداد اپاہج اور یتیم بچوں کی ہے۔ ایسی ہولناک کہانیاں سنی جاتی ہیں کہ وہاں کے دور افتادہ دیہات میں، جہاں سڑک کے راستے پہنچنا ناممکن ہے، جب ہوائی جہازوں سے مصنوعی بازو اور ٹانگیں گرائی جاتی ہیں تو انھیں حاصل کرنے کی کوشش میں بھگدڑ مچ جاتی ہے۔ افغانستان کی معیشت برباد ہو چکی ہے۔ درحقیقت کسی حملہ آور فوج کے لیے اصل دشواری یہ ہے کہ افغانستان میں کوئی ایسے روایتی مقامات نہیں ہیں جن کی مدد سے کسی فوجی پیش قدمی کا نقشہ تیار کیا جا سکے — یعنی بڑے شہر، شاہراہیں، صنعتی کارخانے، واٹر ٹریٹمنٹ پلانٹ۔ کھیت اجتماعی قبروں میں

تبدیل ہو چکے ہیں۔ پورا دیہی علاقہ بارودی سرنگوں سے اٹا ہوا ہے، جن کی تعداد کا تازہ ترین تخمینہ ایک کروڑ ہے۔ امریکی حکومت کو یہ سرنگیں ہٹا کر وہاں سڑکیں تعمیر کرنی ہوں گی اس سے پیشتر کہ اس کی فوج وہاں داخل ہو سکے۔

امریکہ کی طرف سے ہونے والے حملے کے خوف سے دس لاکھ شہری اپنے گھروں سے بھاگ کر افغانستان اور پاکستان کی سرحد کے پاس جمع ہو گئے ہیں۔ اقوام متحدہ کا اندازہ ہے کہ 80 لاکھ افغان شہری ایسے ہیں جنھیں ہنگامی امداد کی ضرورت ہے۔ جوں جوں ضرورت کی اشیا ختم ہو رہی ہیں، غذائی اور انسانی امداد کی تنظیموں سے نکل جانے کو کہا جا رہا ہے۔ بی بی سی کی رپورٹ ہے کہ اس علاقے میں موجودہ دور کا بدترین انسانی المیہ شروع ہو چکا ہے۔ ذرا ئی صدی کے لامتناہی انصاف کو دیکھیے۔ تباہ حال لوگ بمباری سے ہلاک کیے جانے کے انتظار میں فاقوں سے مر رہے ہیں۔

امریکہ میں اس قسم کی بے ہودہ باتیں کی گئی ہیں کہ افغانستان کو شدید بمباری کے ذریعے پتھر کے زمانے میں پہنچا دیا جائے گا۔ کسی کو مہربانی کر کے وہاں یہ اطلاع پہنچانی چاہیے کہ افغانستان پہلے ہی سے پتھر کے زمانے میں ہے۔ اگر یہ بات کسی طرح تسکین کا سبب بن سکتی ہو تو یہ بھی بتا دیا جائے کہ اسے اس مقام تک پہنچانے میں امریکہ کی کوششیں بھی پیش پیش رہی ہیں۔ امریکی عوام کو افغانستان کے محل وقوع کا اندازہ کرنے میں قدرے دقت ہو گی (ہمیں ایسی خبریں ملی ہیں کہ اس ملک کے نقشے دھڑا دھڑ بک رہے ہیں)، لیکن واقعہ یہ ہے کہ امریکی حکومت اور افغانستان پرانے واقف کار ہیں۔

1979 میں افغانستان پر سوویت فوجوں کے حملے کے بعد سی آئی اے نے پاکستان کی آئی ایس آئی کے ساتھ مل کر اتنا بڑا خفیہ آپریشن شروع کیا جس کی مثال سی آئی اے کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ان کا مقصد افغانوں کی توانائی کو مجتمع کرنا اور اس توانائی کو سوویت فوجوں کے خلاف صف آرا کر کے اسے ایک مقدس جنگ یا جہاد کی صورت دینا تھا جس کے زیر اثر سوویت یونین میں شامل مسلمان اکثریت کی ریاستیں کمیونسٹ اقتدار کے خلاف اٹھ کھڑی ہوں اور آخرکار اسے متزلزل کر دیں۔ جس وقت یہ جہاد شروع ہوا تھا اس کا مقصد سوویت یونین کے لیے ویتنام جیسی صورتحال پیدا کرنا تھا۔ وہ اس سے کہیں زیادہ بڑی چیز ثابت ہوا۔ برسوں کے عرصے میں سی آئی اے نے، آئی ایس آئی کی مدد

سے۔ 40 مسلمان ملکوں سے تقریباً ایک لاکھ مجاہدین کو بھرتی کیا اور انھیں مالی مدد فراہم کی تا کہ وہ امریکہ کی بالواسطہ جنگ میں سپاہیوں کے طور پر حصہ لیں۔ مجاہدین کی فوج کے عام سپاہیوں کو اس بات کا علم نہ تھا کہ ان کا جہاد دراصل انکل سام کی طرف سے لڑی جانے والی جنگ ہے۔ (ستم ظریفی یہ ہے کہ امریکہ کو بھی علم نہ تھا کہ وہ اپنی رقم سے اپنے ہی خلاف لڑی جانے والی ایک مستقبل کی جنگ تیار کر رہا ہے۔)

1989 میں، دس سال تک مسلسل مزاحمت کا سامنا کرنے کے بعد سوویت فوجیں واپس چلی گئیں اور اپنے پیچھے ایک تباہ شدہ معاشرہ چھوڑ گئیں۔

افغانستان میں خانہ جنگی جاری رہی۔ جہاد پھیل کر چیچنیا، کوسوو اور آخرکار کشمیر تک جا پہنچا۔ سی آئی اے نے رقم اور اسلحے کی فراہمی جاری رکھی، لیکن اخراجات میں اضافہ ہو گیا تھا اور اس کے لیے زیادہ سے زیادہ رقم کی ضرورت پڑ رہی تھی۔ مجاہدین نے کاشتکاروں کو انقلابی ٹیکس کے طور پر افیون کاشت کرنے کا حکم دیا۔ آئی ایس آئی نے افغانستان بھر میں ہیروئن کی فیکٹریوں کا جال بچھانے میں مدد دی۔ سی آئی اے کی آمد کے دو سال کے اندر اندر پاکستان اور افغانستان کا سرحدی علاقہ دنیا بھر میں ہیروئن کی پیداوار کا سب سے بڑا مرکز بن گیا اور امریکی گلیوں میں ہیروئن کی فراہمی سب سے زیادہ یہیں سے ہونے لگی۔ اس تجارت کا منافع، جو اندازے کے مطابق سالانہ سو بلین اور دو سو بلین ڈالر کے درمیان ہے، مزید شدت پسندوں کی بھرتی اور تربیت کے لیے استعمال ہونے لگا۔

1995 میں طالبان نے، جو خطرناک اور سخت گیر بنیاد پرستوں کا ایک مختصر سا گروہ تھے، خانہ جنگی کے نتیجے میں افغانستان کے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ ان کو سی آئی اے کی پرانی رفیق کار آئی ایس آئی کی مالی مدد، اور کئی پاکستانی پارٹیوں کی سیاسی حمایت حاصل تھی۔ طالبان نے ملک میں دہشت کا راج قائم کیا۔ افغانستان کے عام شہری، خصوصاً عورتیں، ان کا پہلا شکار تھے۔ انھوں نے عورتوں کے سکول اور کالج بند کر دیے، عورتوں کو سرکاری ملازمتوں سے نکال دیا، اور اس قسم کے شرعی قوانین نافذ کر دیے جن کی رو سے "بدکردار" عورتوں کو سنگسار کیا جاتا اور غیر اخلاقی حرکات کرنے والی بیواؤں کو زندہ دفن کر دیا جاتا تھا۔ انسانی حقوق کے سلسلے میں طالبان کے سابقہ ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے یہ بات امکان سے باہر معلوم ہوتی ہے کہ جنگ یا عام شہریوں کی ہلاکت کا خطرہ انھیں اپنے راستے سے ہٹانے میں

کامیاب ہوگا۔

جو کچھ اب سے پہلے پیش آیا ہے اس کو نظر میں رکھتے ہوئے کیا اس سے زیادہ ستم ظریفی کی کوئی بات ہو سکتی ہے کہ امریکہ اور روس اس ملک کو نئے سرے سے تباہ کرنے کے لیے اکٹھے ہو گئے ہیں؟ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس تباہ شدہ ملک کو اَور تباہ کیا جا سکتا ہے؟ افغانستان پر بمباری سے صرف ملبہ الٹ پلٹ ہو جائے گا، کچھ پرانی قبریں کھل جائیں گی اور مُردوں کی نیند خراب ہو گی۔

افغانستان کی ویران سرزمین سوویت کیمونزم کا قبرستان اور ایک ایسی یک فریقی دنیا کا آغاز ثابت ہوئی جس پر امریکہ کا تسلط ہے۔ اس نے وہ فضا قائم کرنے میں مدد دی جس پر نئی سرمایہ داری اور گلوبلائزیشن نے اپنا راج شروع کیا، اور اس پر بھی امریکہ کا تسلط ہے۔ اور اب افغانستان ان سپاہیوں کا قبرستان بننے والا ہے جنھوں نے امریکہ کے لیے یہ جنگ لڑی اور جیتی تھی۔

اور امریکہ کے اُس قابلِ اعتماد اتحادی کا کیا بنا؟ پاکستان نے بھی اس عمل میں بے حد نقصان اٹھایا ہے۔ امریکہ نے ان فوجی آمروں کا ساتھ دینے میں کوئی شرم محسوس نہیں کی جنھوں نے اس ملک میں جمہوریت کو جڑ پکڑنے سے روکا ہے۔ سی آئی اے کی آمد سے پہلے وہاں دیہی علاقے میں افیون کے خریداروں کی ایک بہت چھوٹی سی تعداد موجود تھی۔ 1979 اور 1985 کے درمیان ملک میں ہیروئن کی لت کے شکار افراد کی تعداد صفر سے بڑھ کر 15 لاکھ ہو گئی۔ گیارہ ستمبر سے پہلے ہی 30 لاکھ افغان شہری سرحد کے قریب خیموں پر مشتمل پناہ گزیں کیمپوں میں رہ رہے تھے۔ پاکستان کی معیشت رو بہ زوال ہے۔ فرقہ وارانہ تشدد، گلوبلائزیشن کے تحت کی جانے والی معاشی اصلاحات اور منشیات کے تاجروں کے ہاتھوں پاکستانی معاشرہ پارہ پارہ ہو رہا ہے۔ سوویت حملے کا مقابلہ کرنے کی غرض سے قائم کیے گئے دہشت گردوں کے تربیتی کیمپوں اور مدرسوں نے، جو اژدہے کے دانتوں کی طرح ملک کے طول و عرض میں اُگے ہوئے ہیں، ایسے بنیاد پرستوں کو جنم دیا ہے جن کو ملک کے اندر بھی زبردست پذیرائی حاصل ہے۔ طالبان، جن کو برسوں تک پاکستان کی مالی، مادّی اور عملی حمایت حاصل رہی ہے، پاکستان کی اپنی سیاسی پارٹیوں کے ساتھ اتحاد قائم کیے ہوئے ہیں۔

اب امریکی حکومت پاکستان سے کہہ رہی ہے کہ جس پالتو حیوان کو خود اس نے پاکستان کے پچھواڑے پرورش کیا تھا اس کی گردن پر چھری پھیر دی جائے۔ امریکہ کی حمایت کا اعلان کرنے کے

بعد صدر مشرف کو عین ممکن ہے کہ اپنے ملک میں خانہ جنگی جیسی کسی شے کا اندیشہ محسوس ہونے لگے۔

ہندوستان، کچھ تو اپنے جغرافیائی محل وقوع کے باعث اور کچھ اپنے سابقہ رہنماؤں کی بصیرت کی بدولت، خوش قسمتی سے اب تک اس گریٹ گیم میں گھسیٹے جانے سے بچا ہوا ہے۔ اگر وہ اس کھیل کا حصہ بن جاتا تو غالب امکان یہ ہے کہ ہماری جمہوریت، جیسی کچھ بھی وہ ہے، برقرار نہ رہ پاتی۔ آج، جبکہ ہم میں سے کچھ لوگ دہشت زدہ آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، ہندوستانی حکومت جوش سے کولھے ہلا ہلا کر امریکہ سے درخواست کر رہی ہے کہ وہ اپنے فوجی اڈے پاکستان کے بجائے ہندوستان میں قائم کرے۔ پاکستان جن نتائج کا سامنا کر رہا ہے انھیں دیکھنے کے بعد یہ بات صرف عجیب نہیں بلکہ ناقابلِ تصور معلوم ہوتی ہے کہ ہندوستان اس راستے پر چلنے کا خواہش مند ہو۔ تیسری دنیا کا کوئی بھی ملک جس کی معیشت مخدوش اور معاشرتی بنیاد اس قدر پیچیدہ ہو، اسے اب تک اچھی طرح معلوم ہو جانا چاہیے تھا کہ امریکہ جیسی کسی عالمی طاقت کو اندر آنے کی دعوت دینا (خواہ وہ ٹھہرنے کے لیے آ رہا ہو یا محض یہاں سے گزر کر آگے جا رہا ہو) بالکل ایسی بات ہے جیسے آپ کسی اینٹ کو اپنی کار کی ونڈ سکرین میں سے گزرنے کی دعوت دے رہے ہوں۔

آپریشن اینڈیورنگ فریڈم بظاہر امریکی طرزِ زندگی کے تحفظ کے لیے لڑی جانے والی جنگ ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس کا انجام اس طرزِ زندگی کی بیخ کنی پر ہو۔ اس کے نتیجے میں دنیا بھر میں مزید دہشت اور مزید غصہ پیدا ہوگا۔ امریکہ میں رہنے والوں کے لیے اس کا مطلب زندگی بھر مریضانہ غیر یقینی پن کی صورت میں رہنا ہوگا۔ کیا میرا بچہ سکول میں محفوظ ہے؟ کہیں سب وے میں اعصابی گیس نہ چھوڑ دی گئی ہو۔ کیا میرا محبوب آج رات گھر پہنچے گا؟ حیاتیاتی جنگ کے بارے میں کئی انتباہ سامنے آ چکے ہیں — چیچک، طاعون، اینتھریکس، فصلوں کو تباہ کر دینے والے کیمیائی مادّے سے بھرا ہوا پورا جہاز۔ اکا دکا لوگوں کا متواتر مرتے رہنا شاید ایٹم بم کے ہاتھوں ایک ساتھ ہلاک ہو جانے سے کہیں بدتر ثابت ہو۔

امریکی حکومت، اور بلاشبہ دنیا بھر کی حکومتیں جنگی ماحول کو شہری آزادیوں کو محدود کرنے، آزادیِ اظہار کو ختم کرنے، مزدوروں کو بے روزگار کرنے، نسلی اور مذہبی اقلیتوں کو سراسیمہ کرنے، عوامی بھلائی پر کیے جانے والے خرچ میں کٹوتی کرنے اور دفاعی صنعتوں کو زیادہ سرمایہ فراہم کرنے کے

مقصد سے استعمال کریں گی۔ لیکن اس کا حاصل کیا ہوگا؟ صدر بش دنیا کو شر پسندوں سے خالی کرنے میں اتنی ہی کامیابی حاصل کرسکتا ہے جتنی دنیا کو ولیوں سے بھرنے میں۔ امریکی حکومت کے لیے یہ سوچنا بھی انتہائی لغو بات ہے کہ وہ تشدد اور جبر میں اضافہ کر کے دنیا سے دہشت گردی کو ختم کر سکتی ہے۔ دہشت گردی صرف علامت ہے، مرض نہیں۔ دہشت گردی کا کوئی ملک نہیں ہے۔ وہ کوک، پیپسی اور نائیکے کی طرح ایک بین الاقوامی، گلوبل کاروبار ہے۔ گڑبڑ کا ذرا سا اشارہ ملنے پر دہشت گرد اپنا کاروبار سمیٹ کر اپنی فیکٹریوں کو کسی دوسرے ملک میں منتقل کر سکتے ہیں۔ بالکل ملٹی نیشنل کارپوریشنوں کی طرح۔

دہشت گردی کو ایک مظہر کے طور پر شاید کبھی ختم نہ کیا جا سکے۔ لیکن اگر اُسے کسی طرح محدود کیا جانا ہے تو اس کے پہلے قدم کے طور پر امریکہ کو یہ بات کم از کم تسلیم کرنی ہوگی کہ وہ اس سیارے پر دوسری قوموں، دوسرے انسانوں کے ساتھ رہ رہا ہے جو خواہ ٹی وی سکرین پر دکھائی نہ دیتے ہوں مگر اپنی محبتیں، اپنے غم، اپنی کہانیاں، اپنے گیت، اپنے دکھ درد اور، سب سے بڑھ کر، اپنے حقوق رکھتے ہیں۔ لیکن اس کے بجائے، جب امریکی وزیر دفاع ڈونلڈ رمزفیلڈ سے پوچھا گیا کہ وہ کس بات کو اس نئی جنگ میں امریکہ کی فتح سے تعبیر کرے گا، تو اس نے کہا کہ جب وہ دنیا سے یہ بات منوا لے گا کہ امریکیوں کو اپنا طرزِ زندگی قائم رکھنے کا حق حاصل ہے تو وہ سمجھے گا کہ امریکہ نے فتح حاصل کر لی۔

گیارہ ستمبر کا واقعہ اس بات کی ایک ہولناک یاد دہانی ہے کہ دنیا ایک خوفناک راستے پر جا رہی ہے۔ یاد دہانی کا یہ خط ممکن ہے بن لادن ہی نے لکھا ہو (کسے معلوم؟) اور اسے اسی کے ہرکاروں نے مطلوبہ پتے پر پہنچایا ہو، لیکن کوئی تعجب کی بات نہیں ہوگی اگر یہ خط اُن لوگوں کی طرف سے آیا ہو جو امریکہ کی پرانی جنگوں کے شکار ہوئے تھے۔ کوریا، ویت نام اور کمبوڈیا میں ہلاک ہونے والے لاکھوں لوگ، 1982 میں امریکی حمایت سے لبنان پر اسرائیلی حملے کے نتیجے میں ہلاک ہونے والے 17,500 افراد، آپریشن ڈیزرٹ سٹورم میں مارے جانے والے دو لاکھ عراقی، غرب اردن پر اسرائیلی قبضے کی مزاحمت کرتے ہوئے ہلاک ہونے والے ہزاروں فلسطینی۔ اور یوگوسلاویہ، صومالیہ، ہائیتی، چیلے، نکاراگوا، ایل سلوادور، ڈومینکن ریپبلک اور پناما میں مارے جانے والے دسیوں لاکھ لوگ جن کی موت کے ذمے دار دہشت گردوں، آمروں اور نسل کشی کرنے والوں کو امریکہ نے

حمایت، مالی امداد، تربیت اور اسلحے سے لیس کیا تھا۔ اور یہ فہرست کسی بھی طرح مکمل نہیں ہے۔

امریکی عوام، ایک ایسے ملک کے شہری ہوتے ہوئے جو اتنی جنگوں اور تنازعوں میں ملوث رہا ہے، اب تک بہت خوش قسمت رہے ہیں۔ گیارہ ستمبر کا حملہ پچھلے سو برس کے عرصے میں ان کی سرزمین پر ہونے والا محض دوسرا حملہ ہے۔ پہلا حملہ پرل ہاربر پر ہوا تھا۔ اُس حملے کے جواب نے ایک طویل راستہ اختیار کیا لیکن اس راستے کا اختتام ہیروشیما اور ناگاساکی پر ہوا تھا۔ اس بار دنیا سانس روکے ان قیامتوں کا انتظار کر رہی ہے جو حالیہ حملے کے جواب میں ٹوٹنے والی ہیں۔

حال ہی میں کسی نے کہا تھا کہ اگر اسامہ بن لادن کا وجود نہ ہوتا تو امریکہ کو اسے ایجاد کرنا پڑتا۔ لیکن ایک طرح سے اسے امریکہ ہی نے ایجاد کیا ہے۔ وہ ان جہادیوں میں سے ہے جو 1979 میں افغانستان میں سی آئی اے کا آپریشن شروع ہونے کے کچھ عرصے بعد وہاں پہنچے تھے۔ بن لادن کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اسے سی آئی اے نے پیدا کیا اور اب وہ ایف بی آئی کو مطلوب ہے۔ پندرہ دن کے اندر اندر اس نے اس قدر ترقی کی ہے کہ ایک مشتبہ فرد سے سب سے بڑا ملزم بن گیا اور اب ایک ایسا مجرم ہے جسے زندہ یا مردہ پکڑا جانا لازمی ہے۔

کسی بھی اعتبار سے گیارہ ستمبر کے حملوں میں بن لادن کے ملوث ہونے کی کوئی شہادت فراہم کرنا (جو کسی قانونی عدالت کے نزدیک قابلِ قبول ہو) ناممکن ہے۔ اب تک سامنے آنے والی سنگین ترین شہادت بظاہر یہی ہے کہ اس نے ان حملوں کی مذمت نہیں کی ہے۔

بن لادن جس مقام پر اور جن حالات میں رہ رہا ہے، اس کو دیکھتے ہوئے عین ممکن ہے کہ اس نے ان حملوں کی منصوبہ بندی اور عملی کام میں ذاتی طور پر حصہ نہ لیا ہو، کہ وہ اس عمل میں محض ایک متاثر کن شخصیت کی حیثیت رکھتا ہو، جیسے کسی کمپنی کا سی ای او (چیف ایگزیکٹو آفیسر) ہوتا ہے۔ اسے حوالے کیے جانے کے امریکی مطالبے پر طالبان کا ردعمل غیر معمولی طور پر معقول رہا ہے: شہادت فراہم کرو تو ہم اسے حوالے کر دیں گے۔ اس پر صدر بش کا کہنا یہ ہے کہ امریکی مطالبے پر کوئی گفتگو نہیں ہو سکتی۔

(جب کمپنیوں کے سی ای اوز کے دوسرے ملکوں کے حوالے کیے جانے کی بات چل رہی ہو تو کیا ہندوستانی حکومت بھی امریکہ کے سامنے اپنا مطالبہ رکھ سکتی ہے کہ وارن اینڈرسن کو اس کے حوالے

کیا جائے؟ وہ یونین کاربائیڈ نامی اُس کمپنی کا چیئرمین تھا جس کے کارخانے سے خارج ہونے والی زہریلی گیس نے 1984 میں بھوپال میں سولہ ہزار افراد کو ہلاک کر دیا تھا۔ ہم نے تو اس کے سلسلے میں تمام ضروری شہادتیں بھی جمع کر لی ہیں۔ یہ سب دستاویزی شہادتیں فائلوں میں موجود ہیں۔ کیا اُسے مہربانی کر کے ہمارے حوالے کیا جائے گا؟)

لیکن درحقیقت اسامہ بن لادن کون ہے؟ بلکہ مجھے سوال دوسرے طریقے سے پوچھنا چاہیے۔ درحقیقت اسامہ بن لادن کیا ہے؟ یہ امریکہ کا خاندانی راز ہے۔ یہ امریکی صدر کا خفیہ ہمزاد ہے۔ ان تمام چیزوں کا وحشی توام جو تہذیب یافتہ اور خوبصورت ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں۔ امریکی خارجہ پالیسیوں نے — گن بوٹ ڈپلومیسی، ایٹمی ہتھیاروں کے ذخیرے، پوری دنیا پر تسلط کے بھونڈے پن سے ظاہر کیے ہوئے عزائم، غیر امریکی لوگوں کی جانوں سے پُرتحقیر بے نیازی، امریکہ کی وحشیانہ فوجی مداخلتوں، آمرانہ اور ظالم حکومتوں کو ملنے والی امریکی حمایت، اور غریب ملکوں کی معیشت پر ٹڈی دل کی طرح حملہ کرنے والے بے رحم امریکی ایجنڈے نے — دنیا کو جس فالتو پسلی کی بے مصرف حیثیت بخش دی ہے، اسامہ بن لادن کو اسی فالتو پسلی سے تخلیق کیا گیا ہے۔ امریکہ کی پیش قدمی کرتی ہوئی ملٹی نیشنل کارپوریشنیں جو ہمارے اردگرد کی ہوا، ہمارے قدموں تلے کی زمین، ہماری پیاس بجھانے والے پانی، ہمارے ذہنوں میں آنے والے خیالات تک پر قبضہ جما رہی ہیں۔ اب جبکہ خاندانی راز طشت از بام ہو چکا ہے، دونوں جڑواں بھائی اپنی شناخت ایک دوسرے میں گم کرتے جا رہے ہیں، ایک دوسرے کے متبادل معلوم ہونے لگے ہیں۔ دونوں کی بندوقیں، بم، پیسہ اور منشیات دنیا بھر میں ایک دائرے میں گھوم رہے ہیں۔ (جو سٹنگر میزائل افغانستان میں امریکی ہیلی کاپٹروں کا خیر مقدم کریں گے، وہ وہی ہیں جو سی آئی اے نے مجاہدین کو مہیا کیے تھے۔ امریکی نشئی جو ہیروئن پیتے ہیں وہ افغانستان سے آتی ہے۔ بش انتظامیہ نے ابھی کچھ عرصے پہلے افغانستان کو منشیات سے جنگ کرنے کی غرض سے 43 ملین ڈالر کی امداد دی تھی...)

اب بش اور بن لادن اپنی خطابت میں کام آنے والے الفاظ بھی ایک دوسرے سے مستعار لینے لگے ہیں۔ دونوں افراد ایک دوسرے کو سانپ کے سر سے مشابہ قرار دیتے ہیں۔ دونوں خدا کا نام اور پچھلے ہزار سال کے نیکی اور بدی کے استعارے استعمال کرتے ہیں۔ دونوں غیر مبہم طور پر سیاسی

جرائم میں ملوث ہیں۔ دونوں خطرناک طور پر مسلح ہیں — ایک فحش حد تک طاقتور شخص کے ایٹمی ہتھیاروں سے، دوسرا مکمل طور پر بے بس شخص کی بھڑکتی ہوئی تباہ کن طاقت سے۔ یاد رکھنے کی اہم بات یہ ہے ان دونوں میں سے کسی کو بھی دوسرے کا متبادل نہیں سمجھا جا سکتا۔

دنیا کو صدر بش کی جانب سے دیا جانے والا الٹی میٹم — اگر کوئی ہمارے ساتھ نہیں تو ہمارے دشمنوں کے ساتھ ہے — احمقانہ رعونت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا انتخاب ہے جو دنیا کے لوگ نہ کرنا چاہتے ہیں، نہ انھیں کرنا چاہیے، اور نہ انھیں کرنے پر مجبور کیا جانا چاہیے۔

❁❁

جنگ امن ہے

اتوار 7 اکتوبر 2001 کو جب افغانستان پر رات کی تاریکی اتر رہی تھی، امریکی حکومت نے، "دہشت گردی کے خلاف عالمی اتحاد" (جو غالباً اقوامِ متحدہ کا جانشین ادارہ ہے) کی حمایت سے، افغانستان پر ہوائی حملے شروع کیے۔ ٹی وی چینلوں کی سکرینوں پر کمپیوٹر کے تخلیق کردہ کروز میزائل، سٹیلتھ بمبار، ٹوماہاک اور بنکر بسٹر اور مارک 82 ہائی ڈریگ بم جگمگاتے رہے۔ ساری دنیا میں کمسن لڑکے ان سکرینوں کو گنگ چڑھی آنکھوں سے تکتے رہے اور نئے وڈیو گیم خریدنے کی ضد سے دستبردار ہو گئے۔

اقوامِ متحدہ سے، جو اب اپنی اہمیت کھو کر محض ایک بے اثر مخفف رہ گئی ہے، ان ہوائی حملوں کی رسمی اجازت لینے تک کا تکلف نہیں کیا گیا۔ (جیسا کہ میڈلین البرائٹ نے ایک بار کہا تھا، "امریکہ کے لیے جب ممکن ہوتا ہے تو وہ سب کے ساتھ مل کر کارروائی کرتا ہے، اور جب وہ ضروری سمجھتا ہے تو تن تنہا کارروائی کرتا ہے۔") دہشت گردوں کے خلاف "شہادتوں" کو "اتحاد" میں شامل دوست ملکوں کو دکھایا گیا۔ ان دوست ملکوں نے ایک دوسرے سے مشورہ کرنے کے بعد اعلان کیا کہ اس بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ یہ شہادتیں کسی عدالت کے لیے قابلِ قبول ہوں گی یا نہیں۔ اس طرح صدیوں کے عرصے میں وضع کیے جانے والے عدالتی طریقِ کار کو لمحے بھر میں کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا گیا۔

دہشت گردی کے کسی عمل کا جواز یا بہانہ کسی بھی طرح پیش نہیں کیا جا سکتا، خواہ یہ عمل مذہبی بنیاد پرستوں، پرائیویٹ ملیشیاؤں، اور عوامی مزاحمتی تحریکوں کی جانب سے کیا گیا ہو یا اس کے برعکس

یہ تسلیم شدہ حکومتوں کی طرف سے جوابی اقدام کے طور پر شروع کی جانے والی جنگ کی صورت میں ہو۔ افغانستان پر بمباری واشنگٹن اور نیویارک میں ہونے والے واقعات کا بدلہ نہیں ہے۔ یہ دنیا کے لوگوں کے خلاف کی جانے والی دہشت گردی کی ایک اور کارروائی ہے۔ ہلاک کیے جانے ایک ایک فرد کو واشنگٹن اور نیویارک میں مارے جانے والوں کی تعداد میں سے منہا نہیں بلکہ دہشت گردی کے نتیجے میں مارے جانے والوں کی مجموعی تعداد میں شامل کیا جانا چاہیے۔

جنگوں میں لوگ شاذونادر ہی فتح یاب ہوتے ہیں، اور حکومتیں شاذونادر ہی شکست کا منھ دیکھتی ہیں۔ لوگ مارے جاتے ہیں، حکومتیں روپ بدل کر پھر سامنے آ جاتی ہیں۔ پہلے وہ قومی پرچموں کو لوگوں کے دماغوں کے گرد لپیٹ کران کی حقیقی فکر کا گلا گھونٹتی ہیں، پھر اپنی جان بہ رضا ورغبت قربان کرنے والوں کی مسخ شدہ لاشوں کو کفنانے کے لیے انھی پرچموں کو استعمال کرتی ہیں۔ دونوں طرف —افغانستان میں بھی اور امریکہ میں بھی— عام لوگ اپنی اپنی حکومت کی کارروائیوں کے ہاتھوں یرغمال بنے ہوئے ہیں۔ دونوں ملکوں کے باشندوں کے درمیان ایک ایسا رشتہ ہے جس کے وجود سے وہ بے خبر ہیں— دونوں جگہوں پر انھیں ایک اندھی دہشت کے ساتھ زندگی بسر کرنی ہے جس کے ظہور کی کبھی بھی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی۔ افغانستان پر گرائے جانے والے بموں کی ہر تعداد کے بدلے میں امریکہ میں اینتھریکس کے پھیلاؤ، جہازوں کے اغوا اور دوسری دہشت انگیز کارروائیوں کا اجتماعی خوف پیدا ہوگا۔

آج دنیا کو دہشت اور بربریت کی جس پھیلتی ہوئی ولدل کا سامنا ہے، اس سے نجات پانے کا کوئی آسان طریقہ موجود نہیں۔ آج ضروری ہے کہ دنیا ٹھہر کر اپنی اجتماعی دانش کے قدیم اور جدید دونوں قسم کے کنووں میں جھانکے۔ گیارہ ستمبر کو ہونے والے واقعات نے دنیا کو ہمیشہ کے لیے تبدیل کر دیا ہے۔ آزادی، ترقی، دولت، ٹیکنالوجی، جنگ— ان تمام الفاظ نے نئے معنی اختیار کر لیے ہیں۔ حکومتوں کے لیے ضروری ہے کہ ان تبدیلیوں کو تسلیم کریں اور اپنی نئی ذمے داریوں کا کسی قدر ایمانداری اور انکسار کے ساتھ سامنا کریں۔ بدقسمتی سے اب تک بین الاقوامی اتحاد یا طالبان، کسی کے بھی رہنماؤں کی طرف سے احساسِ ذمہ داری کا کوئی اشارہ سامنے نہیں آیا ہے۔

ہوائی حملوں کے آغاز کا اعلان کرتے ہوئے صدر بش نے کہا، ''ہم ایک امن پسند قوم ہیں۔''

امریکہ کے چہیتے ایلچی ٹونی بلیئر نے (جس کے پاس وزیر اعظم برطانیہ کا اضافی قلمدان بھی ہے)، اس کی آواز میں آواز ملائی، ''ہم امن پسند لوگ ہیں۔''

چنانچہ اب ہمیں معلوم ہو گیا ہے: سؤر گھوڑے ہیں۔ لڑکیاں لڑکے ہیں۔ جنگ امن ہے۔

چند روز بعد ایف بی آئی کے ہیڈکوارٹر میں تقریر کرتے ہوے صدر بش نے کہا، ''یہ ہماری ذمے داری ہے۔ یہ ریاست ہاے متحدہ امریکہ کی ذمے داری ہے جو دنیا میں سب سے زیادہ آزاد قوم ہے۔ ایک قوم جس کی بنیاد ان اقدار پر ہے جو نفرت کو مسترد کرتی ہیں، تشدد کو مسترد کرتی ہیں، قاتلوں کو مسترد کرتی ہیں، اور شر کو مسترد کرتی ہیں۔ ہم تھکنے والے نہیں۔''

دوسری جنگ عظیم کے بعد کے عرصے میں امریکہ نے جن ملکوں سے جنگ کی، اور جن پر بمباری کی، ان کی فہرست یہ ہے: چین (1945-46، 1950-53)، کوریا (1950-53)، گواتے مالا (1954، 1967-69)، انڈونیشیا (1958)، کیوبا (1959-60)، بلجیین کانگو (1964)، پیرو (1965)، لاؤس (1964-73)، ویت نام (1961-73)، کمبوڈیا (1969-70)، گریناڈا (1983)، لیبیا (1986)، ایل سلوادور (1980 کا پورا عشرہ)، نکاراگوا (1980 کا پورا عشرہ)، پناما (1989)، عراق (1991-99)، بوسنیا (1995)، سوڈان (1998)، یوگوسلاویہ (1999)۔

اور اب افغانستان۔

یقیناً دنیا کا یہ آزاد ترین ملک تھکنے کا نام نہیں لیتا۔ لیکن وہ کس قسم کی آزادی ہے جس کا پرچم یہ ملک بلند کر رہا ہے؟ اپنی سرحدوں کے اندر: فکر، مذہب اور اظہار کی آزادی، تخلیقی اظہار، غذائی عادات اور (کسی حد تک) جنسی ترجیحات کی آزادی، اور اس کے علاوہ بھی چند نہایت شاندار اور مثالی چیزوں کی آزادی۔ لیکن اپنی سرحدوں کے باہر: تسلط قائم کرنے، تذلیل کرنے اور غلام بنانے کی آزادی — جو عموماً امریکہ کے اصل مذہب یعنی ''آزاد تجارت'' کے فروغ کے لیے ہے۔ اس لیے امریکہ جب اپنی کسی نئی جنگ کو لامتناہی انصاف یا پائیدار آزادی کا نام دیتا ہے تو ہم تیسری دنیا کے لوگ خوف سے لرز اٹھتے ہیں۔ کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ کچھ لوگوں کے لیے لامتناہی انصاف کا مطلب کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ لامحدود ناانصافی ہوگا۔ اور جو شے کچھ لوگوں کے لیے پائیدار آزادی ہے وہ دوسروں کے لیے پائیدار غلامی ثابت ہوگی۔

دہشت گردی کے خلاف عالمی اتحاد دراصل دنیا کے امیر ترین ملکوں کا گٹھ جوڑ ہے۔ دنیا کا تقریباً تمام اسلحہ یہی ملک تیار اور فروخت کرتے ہیں؛ دنیا میں بڑے پیمانے پر ہلاکت پھیلانے والے — کیمیائی، حیاتیاتی اور ایٹمی — ہتھیاروں کے سب سے بڑے ذخیرے انھی ملکوں کے پاس ہیں۔ دنیا میں سب سے زیادہ جنگیں انھی ملکوں نے لڑی ہیں، یہی جدید تاریخ میں نسل کشی، غلامی، گروہی صفائے اور انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے بیشتر واقعات کے ذمے دار ہیں، اور انھوں نے بے شمار آمروں، اور مطلق العنان حکمرانوں کو حمایت اور مالی اور اسلحے کی مدد فراہم کی ہے۔ ان ملکوں نے تشدد کے عمل کی پرستش کر کے اسے تقریباً اُلوہی درجہ بخش دیا ہے۔ طالبان، اپنے تمام تر گناہوں کے باوجود، اس گروہ میں شامل ہونے کی اہلیت نہیں رکھتے۔

طالبان کی تخلیق سرد جنگ کے بعد کے مرحلے میں تباہی، ہیروئن اور بارودی سرنگوں کے عناصر سے ہوئی تھی۔ ان کے رہنما زیادہ سے زیادہ چالیس پینتالیس برس کی عمروں کے ہیں۔ ان میں سے کئی جنگ میں اپنا بازو، اپنی ٹانگ یا اپنی آنکھ گنوا چکے ہیں۔ وہ ایک ایسے معاشرے میں بڑے ہوئے ہیں جو جنگ کے ہاتھوں زخمی اور تباہ ہو چکا ہے۔ بیس برس کے عرصے میں سوویت یونین اور امریکہ نے مل کر 45 بلین ڈالر کی مالیت کا اسلحہ افغانستان میں جھونکا ہے۔ قرونِ وسطیٰ کے اس معاشرے میں جدید دور کی اگر کوئی شے پہنچی ہے تو وہ یہی جدید ترین اسلحہ ہے۔ اس ماحول میں بڑے ہونے والے کم عمر لڑکوں نے — جن میں سے اکثر یتیم ہیں — کھلونوں کی جگہ یہی ہتھیار دیکھے، گھر کی محفوظ اور آرام دہ زندگی کا کبھی تجربہ نہیں کیا، کبھی عورتوں کے ساتھ نہیں رہے۔ اب، بالغوں کے طور پر اور حاکموں کی حیثیت سے، طالبان عورتوں کو زدوکوب کرتے، سنگسار کرتے، اور زنا بالجبر اور وحشیانہ سلوک کا نشانہ بناتے ہیں، کیونکہ وہ نہیں جانتے کہ عورتوں کے ساتھ اور کیا سلوک کیا جائے۔ جنگ کے طویل برسوں نے انھیں نرمی سے عاری، مہربانی اور انسانی ہمدردی سے بیگانہ کر دیا ہے۔ وہ اپنے اردگرد گرتے ہوئے بموں کی دھن پر رقص کرتے ہیں۔ اب انھوں نے اپنے وحشیانہ سلوک کا رخ خود اپنے لوگوں کی طرف موڑ دیا ہے۔

صدر بش سے معذرت کے ساتھ، دنیا کے لوگ امریکہ اور طالبان کے درمیان انتخاب کرنے پر مجبور نہیں ہیں۔ انسانی تہذیب کا تمام تر حسن — ہمارا آرٹ، ہماری موسیقی، ہمارا ادب — ان

دونوں بنیاد پرست نظریاتی انتہاؤں کے باہر واقع ہے۔ اس بات کا کہ دنیا کے تمام لوگ متوسط طبقے کے صارفین بن جائیں اتنا ہی امکان موجود ہے جتنا اس کا کہ دنیا کے سب لوگ ایک ہی مذہب اختیار کر لیں۔ مسئلہ خیر اور شر، یا اسلام اور مسیحیت کے درمیان کشمکش کا نہیں بلکہ دنیا میں دستیاب گنجائش کا ہے۔ رنگارنگی کو کیسے برقرار رکھا جائے، غلبے —— معاشی، فوجی، لسانی، مذہبی، ثقافتی، کسی بھی قسم کے غلبے —— کی منہ زور خواہش کو کس طرح قابو میں رکھا جائے۔ ماحولیات کا کوئی بھی ماہر آپ کو بتا سکتا ہے کہ یک رنگی کا کلچر کس قدر تباہ کن ہوگا۔ ایسی دنیا جس میں کسی ایک ملک کو غلبہ حاصل ہو ایک ایسے ملک کی طرح ہو گی جہاں حکومت کے مقابل صحت مند حزب اختلاف کا وجود نہ ہو۔ یہ کسی نہ کسی طرح کی آمریت بن جائے گی۔ یہ بالکل ایسا ہوگا کہ دنیا کے سر پر ایک پلاسٹک کی تھیلی لپیٹ کر اسے سانس لینے سے روک دیا جائے۔ ایسی کسی بھی تھیلی کو آخرکار پھاڑ کر کھولا جانا لازمی ہوگا۔

اس نئی جنگ کے شروع ہونے سے پہلے، پچھلے بیس سال کے تنازعات میں تقریباً پانچ لاکھ افغان باشندے ہلاک ہو چکے ہیں۔ افغانستان ملبے کا ڈھیر بن گیا، اور اب اس ملبے کو مزید باریک ریت میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ ہوائی حملے شروع ہونے کے دوسرے ہی دن امریکی پائلٹ بم گرائے بغیر واپس اپنے ٹھکانوں پر پہنچنے لگے تھے۔ ایک پائلٹ کے الفاظ میں "افغانستان اہداف ۔ ۔ ۔ مالا مال جگہ نہیں ہے۔" پینٹاگون میں ایک پریس بریفنگ کے دوران امریکی وزیر دفاع ڈونلڈ رمزفیلڈ سے پوچھا گیا کہ کیا امریکہ کو اہداف کی کمی پیش آنے لگی ہے۔ اس نے جواب دیا، "پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم ہر ہدف پر ایک سے زیادہ بار حملے کریں گے۔ اور دوسرے یہ کہ امریکہ کو نہیں بلکہ افغانستان کو اہداف کی کمی پیش آ رہی ہے۔" اس جواب پر بریفنگ روم میں قہقہے بلند ہوئے۔

حملے شروع ہونے کے تیسرے دن امریکی محکمۂ دفاع نے دعویٰ کیا کہ اس نے "افغانستان پر فضائی برتری حاصل کر لی ہے۔" (کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ افغانستان کے پاس جو دو یا سولہ طیارے تھے وہ سب کے سب تباہ کر دیے گئے؟)

افغانستان کی زمین پر شمالی اتحاد —— طالبان کا پرانا دشمن، چنانچہ بین الاقوامی اتحاد کا نیا دوست —— کابل کی طرف پیش قدمی کر رہا ہے۔ (یہاں یہ بات کہہ دینی چاہیے کہ شمالی اتحاد کا ریکارڈ کسی بھی اعتبار سے طالبان سے بہتر نہیں رہا ہے۔ تاہم فی الحال اس بات کو سہولت کی خاطر نظرانداز کیا جا رہا

ہے۔) شمالی اتحاد کے بظاہر میانہ رو، ''قابلِ قبول'' رہنما احمد شاہ مسعود کو ستمبر کے شروع میں ایک خودکش حملے میں ہلاک کر دیا گیا تھا۔ باقی اتحاد وحشی جنگی سرداروں، سابق کمیونسٹوں، اور سخت گیر ملاؤں کا ایک کمزور گٹھ جوڑ ہے۔ یہ نسلی اعتبار سے منقسم جنگ بازوں کا ایک گروہ ہے جو ماضی میں افغانستان میں اقتدار کا مزہ چکھ چکے ہیں۔

امریکہ کے ہوائی حملے شروع ہونے سے پہلے تک شمالی اتحاد کے قبضے میں افغانستان کا تقریباً پانچ فیصد علاقہ تھا۔ اب وہ، بین الاقوامی اتحاد کی مدد سے اور اس کے ''فضائی تحفظ'' میں، طالبان کو شکست دینے کے لیے تیار کھڑا ہے۔ اس دوران طالبان سپاہی، شکست کو سامنے دیکھ کر، ٹوٹ ٹوٹ کر شمالی اتحاد سے ملتے جا رہے ہیں۔ چنانچہ لڑنے والے ایک طرف سے دوسری طرف جانے اور وردیاں تبدیل کرنے میں مشغول ہیں۔ لیکن ایسے کلبیت زدہ کاروبار میں جیسا کہ اس وقت جاری ہے، ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ محبت نفرت ہے۔ شمال جنوب ہے۔ امن جنگ ہے۔

عالمی طاقتوں کے درمیان افغانستان میں ''ایک نمائندہ حکومت قائم کرنے'' پر تبادلۂ خیال ہو رہا ہے۔ یا اس کا دوسرا زیرِ بحث متبادل افغانستان کے 89 سالہ سابق بادشاہ اور 1973 سے روم میں مقیم ظاہر شاہ کی بادشاہت کی بحالی ہے۔ کھیل اسی طرح کھیلا جاتا ہے— صدام حسین کی حمایت کرو، پھر اسے ''نکال دو''؛ مجاہدین کو پیسہ اور ہتھیار دو، پھر بمباری کر کے انھیں ریزہ ریزہ کر دو؛ ظاہر شاہ کو ''لے آؤ''، اور اس پر نگاہ رکھو کہ وہ اچھا لڑکا ثابت ہو رہا ہے یا نہیں۔ (کیا کسی ملک میں نمائندہ حکومت ''قائم کرنا'' ممکن ہے؟ کیا جمہوریت کو آرڈر پر منگوایا جا سکتا ہے، ایکسٹرا پنیر اور چٹنی کے ساتھ؟)

شہریوں کے ہلاک اور زخمی ہونے کی اکادکا خبریں آنے لگی ہیں، اور شہروں کے خالی ہونے کی، کیونکہ وہاں کے باشندے جان بچانے کے لیے سرحدوں کے پاس جمع ہو گئے ہیں جنھیں ان کے لیے بند کر دیا گیا ہے۔ بڑی سڑکیں یا تو دھماکوں میں تباہ ہو گئیں یا بند کر دی گئیں۔ جن لوگوں کو افغانستان میں کام کرنے کا تجربہ ہے ان کا کہنا ہے کہ نومبر کے آتے آتے امدادی قافلوں کے لیے دسیوں لاکھ افغان باشندوں تک پہنچنا ناممکن ہو جائے گا جو آنے والے موسمِ سرما میں فاقوں سے ہلاک ہونے کے نہایت حقیقی خطرے سے دوچار ہیں (اقوامِ متحدہ کے مطابق ان باشندوں کی تعداد 75 لاکھ

ہے)۔ وہ کہتے ہیں کہ جاڑوں کے آنے میں جتنا عرصہ باقی رہ گیا ہے اس میں یا تو جنگ ہو سکتی ہے یا ان فاقہ زدہ افغانوں تک خوراک پہنچانے کی کوشش۔ دونوں چیزیں بیک وقت نہیں ہو سکتیں۔

انسانی ہمدردی کی ایک فراخدلانہ علامت کے طور پر امریکی حکومت نے افغانستان پر ہوائی جہازوں سے 37,000 غذائی پیکٹ گرائے ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ اس قسم کے پچاس لاکھ پیکٹ گرانے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس صورت میں بھی یہ غذا دسیوں لاکھ افغانوں میں سے، جو غذا کے انتہائی ضرورت مند ہیں، صرف نصف ملین یا پانچ لاکھ باشندوں کی صرف ایک وقت کی بھوک مٹا سکے گی۔ امدادی کارکنوں نے امریکی حکومت کے اس عمل کو تعلقات عامہ کی ایک کلبیت زدہ اور خطرناک کوشش قرار دے کر اس کی مذمت کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہوائی جہازوں سے غذا کے پیکٹ گرانا بے مصرف سے بھی بدتر ہے۔ اول تو یہ غذا ان لوگوں تک کبھی نہیں پہنچ سکے گی جنھیں دراصل اس کی ضرورت ہے۔ اس سے بھی زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ جو لوگ ان پیکٹوں کو اٹھانے کے لیے لپکیں گے انھیں بارودی سرنگوں کے پھٹنے سے ہلاک ہونے کا خطرہ درپیش ہوگا۔ ایک المناک غذائی دوڑ!

ان سب باتوں کے باوجود غذائی پیکٹوں کو بے حد تشہیر حاصل ہوئی۔ ان کے مشمولات کی فہرست کو بڑے بڑے اخباروں کے صفحوں پر جگہ ملی۔ یہ تمام مشمولات غیر لحمیاتی اجزا پر مشتمل تھے، مسلم غذائی قوانین کے عین مطابق (!) زرد رنگ کے ہر پیکٹ میں، جسے امریکی پرچم سے آرائش دی گئی تھی، مندرجہ ذیل چیزیں رکھی گئی تھیں: چاول، مونگ پھلی کا مکھن، بین سلاد، سٹرابری جام، کرارے بسکٹ، کشمش، چپٹی روٹی، ایک فروٹ بار، سیزننگ، ماچس، پلاسٹک کے برتنوں کا ایک سیٹ، کاغذی رومال، اور باتصویر ترکیب استعمال۔

تین سال کی متواتر خشک سالی کے بعد جلال آباد میں آسمان سے اترتی ہوئی ایرلائن کی خوراک! ثقافتی بے خبری کی یہ سطح، مہینوں کی فاقہ کشی اور پیس ڈالنے والی مفلسی کا مطلب سمجھنے میں یہ قطعی ناکامی، امریکی حکومت کی طرف سے اس شدید انسانی بے بسی تک کو اپنے سیلف امیج کے فروغ کے لیے استعمال کرنے کی یہ کوشش بیان سے باہر ہے۔

ذرا اس منظرنامے کو الٹ کر دیکھنے کی کوشش کیجیے۔ تصور کیجیے کہ طالبان حکومت نیویارک شہر پر بمباری کرتی ہے، متواتر یہ بات کہتے ہوئے کہ اس کا اصل ہدف امریکی حکومت اور اس کی پالیسیاں

ہیں۔اور فرض کیجیے، بمباری کے درمیانی وقفوں میں طالبان افغان پرچم سے سجے ہوئے غذائی پیکٹ گراتے ہیں جن میں نان اور کباب موجود ہیں۔ کیا نیویارک کے بھلے لوگ اس بات پر کبھی افغان حکومت کو معاف کر سکیں گے؟ خواہ وہ کتنے ہی بھوکے ہوں، خواہ وہ اسے کھانے پر مجبور ہی کیوں نہ ہو جائیں، وہ اس توہین، اس ذلت کو کس طرح فراموش کر سکیں گے؟ نیویارک کے میئر روڈی گیولیانی نے ایک سعودی شہزادے کی طرف سے بھیجا جانے والا ایک کروڑ ڈالر کی امدادی رقم کا چیک لوٹا دیا کیونکہ اس کے ساتھ مشرق وسطیٰ میں امریکی پالیسی کی بابت ایک دوستانہ مشورہ بھی منسلک تھا۔ کیا خودداری ایک ایسی عیاشی ہے جو صرف دولت مندوں کے لیے مخصوص ہے؟

طیش کو مٹانے کے بجائے بھڑکانے کی یہی کوششیں ہیں جو دہشت گردی کو پیدا کرتی ہیں۔ نفرت اور انتقام ایک بار باہر آجائیں تو پھر واپس جا کر اپنے صندوق میں بند ہونے کو تیار نہیں ہوتے۔ ہر ''دہشت گرد'' یا اس کے ''حامی'' کے ہلاک ہونے کے نتیجے میں اس بات کا خاصا امکان موجود ہے کہ اس کی جگہ مستقبل میں کئی دہشت گرد پیدا ہوں گے۔

یہ سلسلہ کہاں جا کر ختم ہوگا؟

تمام خطابت کو ایک طرف رکھتے ہوئے، ایک لمحے کے لیے اس حقیقت پر غور کیجیے کہ دنیا ابھی تک ''دہشت گردی'' کی کوئی قابل قبول تعریف متعین نہیں کر سکی ہے۔ جو شخص ایک ملک کے لیے دہشت گرد ہے وہ دوسرے ملک کے نزدیک مجاہد آزادی ہے۔ اس پورے معاملے کی تہہ میں تشدد کی بابت دنیا کا دوہرا رویہ کارفرما ہے۔ ایک بار تشدد کو جائز سیاسی حربے کے طور پر تسلیم کر لینے کے بعد دہشت گردوں (یا باغیوں یا آزادی کے مجاہدوں) کے اخلاقی اور سیاسی طور پر قابل قبول ہونے کی بات ایک دشوار گذار اور اوبڑ کھابڑ راستے پر سفر کے مترادف ہو جاتی ہے۔ امریکی حکومت نے دنیا کے مختلف خطوں میں بڑی تعداد میں باغیوں اور شرپسندوں کو رقم، ہتھیار اور پناہ فراہم کی ہے۔ سی آئی اے اور پاکستانی آئی ایس آئی نے مجاہدین کو تربیت اور اسلحے سے لیس کیا جنھیں 1980 کے عشرے میں سوویت مقبوضہ افغانستان کی حکومت دہشت گرد تصور کرتی تھی۔ صدر ریگن نے ان کے ساتھ گروپ فوٹو بنوایا تھا اور انھیں امریکہ کے بنیاد گذار رہنماؤں (founding fathers) کے مساوی قرار دیا تھا۔ آج پاکستان — جو اس نئی جنگ میں امریکہ کا اتحادی ہے — اُن باغیوں کو امداد دیتا ہے

جو سرحد پار کر کے ہندوستانی کشمیر میں داخل ہوتے ہیں۔ پاکستان انھیں ''مجاہدین آزادی'' کہہ کر سراہتا ہے، ہندوستان انھیں ''دہشت گرد'' کہتا ہے۔ ہندوستان ان ملکوں کی مذمت کرتا ہے جو دہشت گردی کی حمایت اور اعانت کرتے ہیں، لیکن خود ہندوستان اُن علیحدگی پسند تاملوں کو تربیت فراہم کر چکا ہے جو سری لنکا میں ایک علیحدہ وطن حاصل کرنا چاہتے ہیں — یعنی لبریشن ٹائیگرز آف تامل ایلام (LTTE) کو جو خوں آشام دہشت گردی کی بے شمار کارروائیوں کی ذمے دار ہے۔ (بالکل اسی طرح جیسے سی آئی اے نے مجاہدین سے اپنا مقصد پورا کرنے کے بعد انھیں چھوڑ دیا تھا، ہندوستان نے بھی تامل علیحدگی پسندوں کی طرف پیٹھ موڑ لی۔ 1991 میں ہندوستانی وزیر اعظم راجیو گاندھی کو ہلاک کرنے والی ایل ٹی ٹی ای کی ایک ناراض خودکش بمبار ہی تھی۔)

حکومتوں اور سیاست دانوں کے لیے یہ سمجھنا بہت اہم ہے کہ ان وسیع اور بلاخیز انسانی احساسات کو اپنے محدود مقاصد کے لیے استعمال کرنا ممکن ہے فوری طور پر مفید ثابت ہو، لیکن انجام کار، اور ناگزیر طور پر، اس کے تباہ کن نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ مذہبی جذبات کو سیاسی موقع پرستی کے مقاصد کے لیے استعمال کرنا وہ خطرناک ترین ورثہ ہے جو حکومتیں یا سیاست کار دنیا کے — اور خود اپنے — عوام کو دے سکتے ہیں۔ ایسے معاشروں میں جو مذہبی یا فرقہ وارانہ شدت پسندی کے ہاتھوں پارہ پارہ ہیں، رہنے والے لوگ جانتے ہیں کہ ہر مذہبی متن کو — انجیل سے لے کر بھگوت گیتا تک — غلط تعبیر کے ذریعے ایٹمی جنگ، نسل کشی، کارپوریٹ گلوبلائزیشن، کسی بھی بات کا جواز بنا کر پیش کیا جا سکتا ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان دہشت گردوں کو جنھوں نے گیارہ ستمبر کی ہولناک کارروائیاں کیں، تلاش کر کے سزا نہیں دی جانی چاہیے۔ ضرور دی جانی چاہیے۔ لیکن کیا جنگ ان کو گرفت میں لانے کا بہترین طریقہ ہے؟ کیا بھوسے کے ڈھیر کو آگ لگا دینے سے اس میں چھپی ہوئی سوئی مل جائے گی؟ یا اس سے غصہ اور بڑھے گا اور دنیا ہم سب کے لیے سچ مچ کا جہنم بن جائے گی؟

اگر بات اسی پر آ جائے تو آخر آپ کتنے لوگوں کے پیچھے جاسوس لگا سکتے ہیں، کتنے بینک اکاؤنٹ منجمد کر سکتے ہیں، کتنی گفتگوؤں کو چوری چھپے کان لگا کر سن سکتے ہیں، کتنے ای میل پیغامات روک کر پڑھ سکتے ہیں، کتنے خط راستے میں کھول سکتے ہیں، کتنے فون ٹیپ کر سکتے ہیں؟ گیارہ ستمبر سے

پہلے بھی سی آئی اے اتنی کثیر مقدار میں اطلاعات جمع کر چکی تھی جن کی جانچ پڑتال کرنا انسانی استطاعت سے باہر ہے۔ (بعض اوقات حد سے زیادہ اطلاعات بھی سمجھداری کی راہ مسدود کر دیتی ہیں ــــ یہ تعجب کی بات نہیں کہ امریکی جاسوس سیارچوں کو 1998 میں ہندوستان کی نیوکلیئر آزمائشوں کی قبل از وقت خبر نہ ہو سکی۔ مخبری اور جاسوسی کی یہ مطلوبہ سطح انتظامی، اخلاقی اور شہری آزادی کے اعتبار سے ایک بھیانک خواب کی طرح ہو گی۔ اس کے نتیجے میں ہر شخص اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے گا۔ اور آزادی ــــ جو سب سے زیادہ، سب سے زیادہ قیمتی شے ہے ــــ سب سے پہلے شکار ہو جائے گی۔ یہ تو ابھی سے زخمی اور لہولہان ہو چکی ہے۔

ساری دنیا کی حکومتیں خوف کی موجودہ فضا کو بڑی سفاکی اور چالاکی سے اپنے مفادات کو بڑھاوا دینے کے لیے استعمال کر رہی ہیں۔ ہر قسم کی ناقابل اعتبار سیاسی قوتوں کو بے لگام چھوڑا جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر ہندوستان میں کل ہند عوامی مزاحمتی فورم کے ارکان کو، جو دہلی میں جنگ اور امریکہ کے خلاف پمفلٹ بانٹ رہے تھے، گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ ان پمفلٹوں کو چھاپنے والے پریس کے مالک کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ دائیں بازو سے تعلق رکھنے والی حکومت نے (جو اپنے اندر وشو ہندو پریشد اور بجرنگ دَل جیسے انتہاپسند ہندو گروپوں کو پناہ دیے ہوئے ہے) سٹوڈنٹس اسلامک موومنٹ آف انڈیا (SIMI) پر پابندی لگا دی ہے اور اب وہ ایک قدیم دہشت گرد مخالف ایکٹ کو زندہ کرنے کی فکر میں ہے جسے اُس وقت واپس لے لیا گیا تھا جب انسانی حقوق کے کمیشن نے اطلاع دی تھی کہ اس کا جائز سے زیادہ ناجائز استعمال ہو رہا ہے۔ ہندوستان کے کروڑوں شہری مسلمان ہیں۔ کیا انھیں بیگانہ کر دینے سے کوئی مفید مقصد حاصل ہو سکتا ہے؟

جب تک یہ جنگ جاری ہے، ہر روز مشتعل جذبات متواتر دنیا میں پھیل رہے ہیں۔ بین الاقوامی ذرائع ابلاغ کو جنگ زدہ خطے تک آزاد رسائی حاصل نہیں۔ یوں بھی، مین سٹریم ذرائع ابلاغ نے خصوصاً امریکہ میں، زمین پر لیٹ کر فوجی ترجمانوں اور سرکاری اہلکاروں سے پریس ہینڈ آؤٹس کے ذریعے اپنے پیٹ میں گدگدیاں کرواتے کا وطیرہ اختیار کر لیا ہے۔ افغان ریڈیو سٹیشن بمباری سے تباہ کیے جا چکے ہیں۔ طالبان ہمیشہ سے پریس کو شک کی نگاہ سے دیکھتے رہے ہیں۔ پروپیگنڈا کی جنگ میں کسی کو درست اندازہ نہیں ہے کہ کتنے لوگ مارے جا چکے ہیں یا کتنی تباہی ہو چکی ہے۔ قابل

اعتبار اطلاعات کی عدم موجودگی میں ہر قسم کی عجیب و غریب افواہیں پھیلتی ہیں۔

دنیا کے اس خطے میں زمین سے کان لگا کر سنیں تو آپ کو پھیلتے ہوئے غصے کی دھمک سنائی دے سکتی ہے۔ خدارا اب اس جنگ کو روکیے۔ بہت لوگ مارے جا چکے ہیں۔ سمارٹ میزائل اپنے نشانے میں اتنے زیادہ سمارٹ نہیں۔ وہ دبائے ہوئے غصے کے پورے پورے ذخیروں کو دھماکے سے زندہ کر رہے ہیں۔

صدر جارج بش نے حال ہی میں دعویٰ کیا: ''جب میں کارروائی شروع کروں گا تو دس ڈالر مالیت کے خالی خیمے پر بیس لاکھ ڈالر قیمت کا میزائل پھینک کر ایک اونٹ کی پیٹھ کو زخمی نہیں کروں گا۔ یہ فیصلہ کن کارروائی ہوگی۔'' صدر بش کو معلوم ہونا چاہیے کہ افغانستان میں ایسا کوئی ہدف موجود نہیں جو اس کے میزائل کی قیمت کا ہم پلہ ہو۔ شاید محض اپنے حساب کتاب کو درست رکھنے کے لیے ہی سہی، اسے سستے میزائل تیار کرانے چاہییں جنھیں دنیا کے غریب ملکوں میں کم مالیت کے اہداف اور کم قیمت زندگیوں کو نشانہ بنانے کے لیے استعمال کیا جا سکے۔ لیکن عالمی اتحاد کی اسلحہ ساز کمپنیوں کے لیے یہ بات تاجرانہ دانشمندی کے منافی ہوگی۔ مثال کے طور پر یہ بات کارلائل گروپ کے نزدیک — جسے انڈسٹری سٹینڈرڈ نے دنیا کی سب سے بڑی پرائیویٹ ایکویٹی فرم قرار دیا ہے اور جس کے زیرِ انتظام 12 بلین ڈالر کا سرمایہ ہے — یہ بات بالکل لغو ہوگی۔ کارلائل گروپ دفاعی شعبے میں سرمایہ کاری کرتا ہے اور فوجی تنازعات اور اسلحے پر کیے جانے والے اخراجات کے ذریعے منافع کماتا ہے۔

کارلائل کو چلانے والے افراد بے داغ ریکارڈ رکھتے ہیں۔ سابق امریکی وزیرِ دفاع فرینک کارلوچی کارلائل کا چیئرمین اور مینیجنگ ڈائرکٹر ہے (کالج میں وہ ڈونلڈ رمزفیلڈ کا روم میٹ تھا)۔ کارلائل کے دوسرے پارٹنروں میں سابق امریکی وزیرِ خارجہ جیمز اے بیکر سوم، جارج سوروز اور فریڈ میلک (جو جارج بش سینئر کی انتخابی مہم کا نگران تھا) شامل ہیں۔ ایک امریکی اخبار — بالٹی مور کرانیکل اینڈ سینٹینل — کا کہنا ہے کہ صدر جارج بش سینئر ایشیائی منڈیوں میں کارلائل گروپ کے لیے سرمایہ کاری کے موقعوں کی تلاش میں ہے۔ اطلاعات کے مطابق اس نے ممکنہ حکومتی گاہکوں کو ''تحائف'' پیش کرنے کے لیے خاصی خطیر رقمیں مخصوص کی ہیں۔

اوہو! جیسا کہ پرانی فرسودہ کہاوت ہے، یہ سب خاندانی معاملہ ہے۔

پھر اس خاندانی کاروبار کی دوسری شاخ ہے — تیل۔ یاد رکھیے، صدر جارج بش (جونیئر) اور نائب صدر ڈک چینی دونوں نے اپنی دولت امریکی تیل کی صنعت میں کام کر کے کمائی ہے۔

ترکمانستان میں، جو افغانستان کی شمال مغربی سرحد پر واقع ہے، دنیا کے تیسرے سب سے بڑے گیس کے ذخیرے اور تیل کے چھ ارب بیرل کے ذخیرے موجود ہیں۔ گیس اور تیل کے یہ ذخائر، ماہرین کے کہنے کے مطابق، امریکہ کی توانائی کی ضروریات کو اگلے تیس سال تک (اور کسی ترقی پذیر ملک کی ضروریات کو کئی صدیوں تک) پورا کر سکتے ہیں۔ امریکہ نے تیل کو ہمیشہ اپنے سلامتی کے معاملات میں شامل کیا ہے اور اس کی حفاظت کے لیے ہر قسم کے اقدامات کو جائز سمجھا ہے۔ ہم میں سے کم ہی لوگوں کو اس بات پر شبہ ہوگا کہ خلیج فارس کے علاقے میں امریکہ کی فوجی موجودگی کا تعلق انسانی حقوق کی بابت اس کی تشویش سے بہت کم اور تقریباً مکمل طور پر تیل کے شعبے میں اس کے سٹریٹیجک مفاد سے ہے۔

بحیرۂ خزر (کیسپین) کے خطے میں پائے جانے والے تیل اور گیس کے ذخائر کا رخ فی الحال مغرب میں واقع یورپی منڈیوں کی طرف ہے۔ جغرافیائی اور سیاسی اعتبار سے ایران اور روس امریکی مفادات کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ 1998 میں ڈک چینی نے — جو اس وقت ہیلی برٹن کمپنی کا چیف تھا، جو تیل کی صنعت میں نمایاں مقام رکھتی ہے — کہا تھا: ''میں کسی ایسے موقعے کا تصور نہیں کر سکتا جب ایک پورا جغرافیائی خطہ اتنے اچانک اور وقائع طور پر اتنے اہم انداز سے ابھر کر سامنے آیا ہو جیسے کیسپین کا خطہ سامنے آیا ہے۔ بالکل یوں لگتا ہے جیسے مواقع راتوں رات پیدا ہو گئے ہوں۔'' بالکل درست!

گزشتہ کئی برسوں سے ایک بہت بڑی امریکی تیل کمپنی یونوکول افغانستان سے ہو کر پاکستان اور اس سے آگے بحیرۂ عرب تک جانے والی پائپ لائن بچھانے کی اجازت کے لیے طالبان کے ساتھ مذاکرات کر رہی تھی۔ اس مقام سے یونوکول جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا کی ابھرتی ہوئی منڈیوں تک رسائی حاصل کرنے کی امید رکھتی ہے۔ 1997 میں طالبان ملاؤں کے ایک وفد نے امریکہ کا دورہ کیا تھا اور ہوسٹن میں امریکی وزارت خارجہ کے اہلکاروں اور یونوکول کے ایگزیکٹوز سے بھی ملاقات کی تھی۔ اس موقعے پر سرعام پھانسیاں دینے سے طالبان کے شغف اور افغان عورتوں

کے ساتھ ان کے سلوک کو انسانیت کے خلاف جرائم کے طور پر پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی جیسا کہ آج کل پیش کیا جا رہا ہے۔ اگلے چھ مہینوں تک امریکہ میں عورتوں کی ناراض تنظیموں کو اس مسئلے پر کلنٹن انتظامیہ پر بہت زیادہ دباؤ ڈالنا پڑا تھا۔ خوش قسمتی سے وہ اُس سودے کو رکوانے میں کامیاب رہیں۔ اور اب ایک بار پھر امریکی تیل کی صنعت کو ایک سنہری موقع ملا ہے۔

امریکہ میں اسلحے کی صنعت، تیل کی صنعت، ذرائع ابلاغ کے بڑے بڑے نیٹ ورک، اور بلاشبہ امریکی خارجہ پالیسی، کا کنٹرول انھی تجارتی گروپوں کے ہاتھوں میں ہے۔ چنانچہ یہ توقع کرنا احمقانہ بات ہوگی کہ ہتھیاروں اور تیل کے ذخیروں اور دفاعی معاہدوں کی یہ باتیں کبھی درست تفصیل کے ساتھ بڑے ذرائع ابلاغ میں جگہ پا سکیں گی۔ اور پھر یوں بھی امریکی عوام کو، جنھیں تازہ زخم لگا ہے، جن کے ذہن صدمے سے ماؤف اور تکلیف میں مبتلا ہیں، جن کے وقار کو ٹھیس لگے ابھی بہت دن نہیں ہوے، جن کے پیارے المناک موت کا شکار ہوے ہیں، اور جن کا غم و غصہ تازہ اور تیز ہے، ''تہذیبوں کے تصادم'' اور ''حق بمقابلہ باطل'' کی باتیں بالکل درست معلوم ہوتی ہیں۔ اور سرکاری ترجمان یہ باتیں وٹامن کی گولیوں یا ڈپریشن کم کرنے والی دوا کی روزانہ خوراک کی طرح پابندی سے ان تک پہنچاتے ہیں۔ پابندی سے دی جانے والی اس دوا کے نتیجے میں مین لینڈ امریکہ ایک ایسا ہی معما بنا رہے گا جیسا کہ وہ اب تک ہے — عجیب طور سے الگ تھلگ اور بے خبر رہنے والے لوگ، جن کی باگیں ایک مداخلت کار اور بے باک حکومت کے ہاتھوں میں ہیں۔

اور دوسری طرف ہمارا یعنی باقی سب کا کیا حال ہے جو اس احمقانہ پروپیگنڈا کے بے حس ہدف ہیں؟ جو مونگ پھلی کے مکھن اور سٹرابری جام میں لتھڑی ہوئی جھوٹ اور بربریت کی اس غذا پر پل رہے ہیں جو روزانہ ہمارے دماغوں پر بالکل اسی طرح گرائی جاتی ہے جیسے افغانستان پر زرد غذائی پیکٹ برسائے جا رہے ہیں؟ کیا ہم نظریں چرا کر یہ غذا کھاتے رہیں گے، محض اس لیے کہ ہم بھوکے ہیں؟ یا پھر ہم آنکھیں کھول کر، پلک جھپکائے بغیر اس المناک ڈرامے کو دیکھیں گے جو افغانستان میں کھیلا جا رہا ہے، اور آخرکار اجتماعی طور پر اُلٹی کریں گے اور یک آواز ہو کر کہیں گے کہ بس، اب بہت ہو چکا؟

اب جبکہ نئی صدی کا پہلا سال خاتمے کے قریب ہے، میں سوچتی ہوں — کیا ہم اپنے خواب

دیکھنے کے حق سے دستبردار ہو چکے ہیں؟ کیا ہم کبھی دوبارہ حسن کا تصور کرنے کے قابل ہو سکیں گے؟ کیا ایسا پھر کبھی ممکن ہوگا کہ ہم دھوپ میں چھپکلی کے نوزائیدہ بچے کی حیران پلکوں کے جھپکنے کے سست رفتار عمل کا مشاہدہ کرسکیں، یا کسی گلہری کو، جس نے ہم سے سرگوشی میں کچھ کہا ہو، سرگوشی میں جواب دے سکیں، اور اس عمل میں ہمیں ورلڈ ٹریڈ سنٹر کا اور افغانستان کا خیال نہ آئے؟

❁❁

نائن الیون نہیں

ہمیں اپنے المیوں پر بھی کوئی حق حاصل نہیں رہا۔ جوں جوں ممبئی کا سانحہ، ایک ایک ہولناک دن کر کے، وقوع پذیر ہو رہا تھا، چوبیس گھنٹے چلنے والے نیوز چینل ہمیں اطلاع دیتے جا رہے تھے کہ یہ ''ہندوستان کا نائن الیون'' ہے۔ کسی پرانی ہالی وُڈ فلم کے بالی وُڈ میں بنائے گئے چربے کی طرح ہم سے اپنے پارٹ ادا کرنے اور اپنے مکالمے ادا کرنے کی توقع کی جاتی ہے، حالانکہ ہم جانتے ہیں کہ یہ سب کچھ پہلے کہا اور کیا جا چکا ہے۔

بڑھتے ہوئے تناؤ میں امریکی سینیٹر جان مک کین نے پاکستان کو تنبیہ کی ہے کہ اگر اس نے فوراً ''برے لوگوں'' (Bad Guys) کو گرفتار نہ کیا تو اس کے پاس ذاتی اطلاع ہے کہ ہندوستان پاکستان میں موجود ''دہشت گردی کے کیمپوں'' پر ہوائی حملے کر سکتا ہے، اور امریکہ اس سلسلے میں کچھ کرنے سے قاصر ہے کیونکہ ممبئی ہندوستان کا نائن الیون ہے۔

لیکن نومبر ستمبر نہیں، دو ہزار آٹھ دو ہزار ایک نہیں، پاکستان افغانستان نہیں، اور ہندوستان امریکہ نہیں۔ چنانچہ شاید ہمیں اپنا المیہ واپس لینا چاہیے، اور اس ملبے کو اپنے ذہنوں اور اپنے ٹوٹے ہوئے دلوں کی مدد سے کریدنا چاہیے تاکہ ہم خود اپنے نتائج تک پہنچ سکیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ نومبر کے آخری ہفتے میں کشمیر کے لوگ، ہزاروں ہندوستانی فوجیوں کی نگرانی میں، ووٹ ڈالنے کے لیے قطاروں میں کھڑے تھے، جبکہ ہندوستان کے امیر ترین شہر کا امیر ترین علاقہ جنگ زدہ کپواڑا کا منظر دکھا رہا تھا جو کشمیر کا سب سے زیادہ تباہ شدہ ضلع ہے۔

ممبئی پر ہونے والا حملہ اس سال ہندوستان کے شہروں اور قصبوں پر ہونے والے دہشت گردی کے حملوں میں محض تازہ ترین ہے: احمد آباد، بنگلور، دہلی، گوہاٹی، جے پور اور مالیگاؤں میں بم کے دھماکوں سے سینکڑوں عام لوگ ہلاک اور زخمی ہو چکے ہیں۔ ان حملوں کے سلسلے میں جو مشتبہ لوگ — ہندو اور مسلمان دونوں، سب کے سب ہندوستانی باشندے — گرفتار کیے گئے ہیں اگر ان کے بارے میں پولیس کا بیان درست ہے تو اس کا مطلب ہے، اس ملک میں کہیں بہت بڑی گڑبڑ ہو رہی ہے۔

اگر آپ ٹی وی دیکھتے رہے ہیں تو شاید آپ کو پتا بھی نہ چلا ہو کہ ممبئی میں کچھ عام لوگ بھی ہلاک ہوے ہیں۔ انھیں ایک ریلوے سٹیشن اور ایک عام ہسپتال میں گولیوں کی باڑھ سے ہلاک کیا گیا۔ دہشت گردوں نے امیر غریب میں فرق نہیں کیا۔ دونوں کو ایک جیسی سفاکی سے ہلاک کیا۔ لیکن دوسری طرف ہندوستانی میڈیا کی نظریں خیرہ ہو کر اُس ہولناکی پر جم گئیں جس نے انڈیا شائننگ کی چمکدار رکاوٹیں توڑ کر اپنا تعفن دو ناقابلِ یقین حد تک تعیشانہ ہوٹلوں کی لابیوں اور ایک چھوٹے سے یہودی مرکز تک پہنچا دیا تھا۔

ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ان میں سے ایک ہوٹل ممبئی شہر کا نشان (icon) ہے۔ یہ بالکل سچ ہے۔ یہ اس سہل اور فحش ناانصافی کا نشان ہے جسے عام لوگ ہر روز جھیلتے ہیں۔ اس دن جب اخبار حسین افراد کے لکھے ہوے ان تعزیت ناموں سے بھرے ہوے تھے جو انھوں نے ہوٹل کے ان کمروں کی یاد میں لکھے تھے جہاں وہ کبھی ٹھہرے تھے، ان ذائقہ نواز ریستورانوں کی یاد میں جن سے انھیں محبت تھی (ستم ظریفی یہ ہے کہ ان میں ایک ریستوران کا نام ''قندھار'' تھا)، اور ان ملازموں کی یاد میں جو ان کی خدمت کیا کرتے تھے، ان میں سے ایک قومی روزنامے کے اندر کے صفحے پر اوپر بائیں ہاتھ کے کونے میں ایک چھوٹے سے باکس میں (جس کی قیمت غالباً ایک پیزا کمپنی نے ادا کی تھی) کہا گیا تھا: ''ہنگری کیا؟'' (Hungry kya?) اس میں یقیناً نہایت نیک دلی کے ساتھ پڑھنے والوں کو اطلاع دی گئی تھی کہ بھوک کے بین الاقوامی اشاریے کے اعتبار سے ہندوستان کا مقام ابھی سوڈان اور صومالیہ سے نیچے ہے۔ لیکن ظاہر ہے، یہ ''وہ جنگ'' نہیں ہے۔ وہ جنگ تو ہمارے دیہات کی دلت بستیوں میں، نرمدا اور کوئل کا روندیوں کے کناروں پر، چھتیگارا کی ربڑ کی جاگیروں میں، نندی گرام،

سینگور، چھتیس گڑھ، جھارکھنڈ، اڑیسہ کے گاؤوں میں، مغربی بنگال کے لال گڑھ میں اور ہمارے وسیع و عریض شہروں کی مفلوک الحال بستیوں اور جھونپڑ پٹیوں میں لڑی جارہی ہے۔

وہ جنگ ٹی وی پر دکھائی نہیں دیتی — ابھی تک تو نہیں۔ چنانچہ، اور سب کی طرح، کیوں نہ ہم اس جنگ پر توجہ کریں جو ٹی وی پر دکھائی جارہی ہے۔

دہشت گردی کے بارے میں حالیہ بحث کرنے والوں کو ایک سخت، سفاک اور بے رحم لکیر دو دھڑوں میں بانٹے ہوئے ہے۔ ایک طرف کے لوگ (جنھیں ہم فریق A کہیں گے) وہ ہیں جو دہشت گردی کو، خصوصاً ''اسلام پسند'' (Islamist) دہشت گردی کو، ایک ایسی مکروہ، قابلِ نفرت اور جنونی شے سمجھتے ہیں جو اپنے ہی محور پر، اپنے مدار میں گھوم رہی ہے اور اپنے اردگرد کی دنیا سے کوئی تعلق نہیں رکھتی؛ تاریخ، جغرافیہ اور معاشیات سے قطعی کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ چنانچہ، فریق A کا کہنا ہے، اسے سیاسی تناظر میں رکھنے، یا محض اسے سمجھنے کی کوشش کرنا اسے جائز ٹھہرانا ہے، اور یہ بذاتِ خود ایک جرم ہے۔

فریق B اس پر یقین رکھتا ہے کہ اگرچہ کوئی چیز دہشت گردی کا جواز نہیں بن سکتی، لیکن دہشت گردی زمان و مکاں اور سیاست کے ایک مخصوص تناظر میں واقع ہوتی ہے، اور اسے اس تناظر میں دیکھنے سے انکار کرنا مسئلے کو مزید سنگین بنانا اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کو خطرے میں ڈالنا ہے۔

حافظ سعید کے اقوال، جس نے 1990 میں لشکرِ طیبہ قائم کی اور جو اسلام کے سخت گیر سلفی مسلک سے تعلق رکھتا ہے، یقیناً فریق A کے موقف کو تقویت دیتے ہیں۔ حافظ سعید خودکش بم حملوں کو جائز ٹھہراتا ہے، یہودیوں، شیعوں اور جمہوریت سے نفرت کرتا ہے، اور یہ مانتا ہے کہ اس وقت تک جہاد کیا جائے جب تک اسلام — اُس کا اسلام — دنیا پر تسلط قائم نہ کرلے۔ اس کے اقوال میں یہ بھی شامل ہے: ''جب تک انڈیا سلامت ہے اس وقت تک امن قائم نہیں ہوسکتا۔ انھیں کاٹ ڈالو، انھیں اتنا کاٹو کہ وہ گھٹنوں کے بل تمھارے سامنے جھک جائیں اور رحم کی التجا کریں۔''

اور: ''انڈیا نے ہمیں یہ راستہ دکھایا ہے۔ جس طرح وہ کشمیر میں مسلمانوں کو قتل کررہا ہے، ہم ہندوؤں کو قتل کرکے اسے اسی کی زبان میں جواب دیں گے۔''

لیکن فریق A احمد آباد میں رہنے والے بابو بجرنگی کو کہاں رکھے گا، جو خود کو دہشت گرد نہیں بلکہ

جمہوریت پسند سمجھتا ہے؟ وہ 2002 میں گجرات میں ہونے والی نسل کُشی کا ایک اہم کردار تھا اور اس نے (کیمرے کے سامنے) کہا تھا: ''ہم نے میاں کی ایک دکان نہیں چھوڑی تھی، سب کو جلا دیا تھا۔ اور ان کو سب کو جلایا تھا، کاٹا تھا... ہمارا ماننا ہے کہ ان کو جلانا چاہیے، کیونکہ یہ حرامی جلنا نہیں چاہتے، ڈرتے ہیں جلنے سے... میری بس ایک آخری خواہش ہے... پھر چاہے پھانسی پر چڑھا دو... مجھے صرف دو دن چاہییں، میں جوہاپورہ میں جاؤں گا جہاں سات آٹھ لاکھ میاں لوگ رہتے ہیں... ان سب کو ختم کر دوں گا... اور مریں، کم سے کم 25000 سے 50000 تک مرنے چاہییں...''

اور فریق A کی ترتیب میں آر ایس ایس کی بائبل یعنی ایم ایس گولوالکر کی کتاب *We, or Our Nationhood Defined* کو کہاں رکھا جائے گا جو 1944 میں آر ایس ایس کا سربراہ بنا تھا۔ اس کتاب میں لکھا ہے: ''اس منحوس دن سے لے کر جب مسلمانوں نے ہندوستان میں پہلی بار قدم رکھا، آج اس وقت تک، ہندو قوم ان ملیچھوں سے مسلسل بہادری کے ساتھ لڑتی آئی ہے۔ نسلی جذبہ ہمیشہ بیدار رہا ہے۔''

یا: ''اپنی نسل اور تہذیب کا خالص پن قائم رکھنے کے لیے، جرمنی نے اپنے ملک کو سامی نسل والوں یعنی یہودیوں سے پاک کر کے دنیا کو چونکا دیا ہے۔ یہاں نسلی تفاخر اپنے بلند ترین درجے میں ظاہر ہوا ہے... ہم ہندوستانیوں کو اس مثال سے سیکھنا اور فائدہ اٹھانا چاہیے۔''

(ظاہر ہے کہ ہندو دائیں بازو کی بندوق کی زد میں صرف مسلمان ہی نہیں ہیں۔ دلتوں کو متواتر نشانہ بنایا جاتا رہا ہے۔ حال ہی میں اڑیسہ میں کھنڈامل کے مقام پر عیسائیوں کو ڈھائی مہینے سے تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے جس کے نتیجے میں 40 سے زیادہ لوگ ہلاک ہو چکے ہیں۔ چالیس ہزار لوگوں کو ان کے گھروں سے بے دخل کر دیا گیا ہے جن میں سے آدھے اب پناہ گزیں کیمپوں میں رہنے پر مجبور ہیں۔)

ان تمام برسوں میں حافظ سعید لاہور میں جماعت الدعوہ کے سربراہ کے طور پر (جسے بہت سے لوگ لشکرِ طیبہ کا سیاسی نقاب سمجھتے ہیں) ایک معزز شخص کی حیثیت سے زندگی گزارتا رہا ہے۔ وہ آج بھی اپنے جنونی جہاد کے لیے کم عمر لڑکوں کو بھرتی کرنے میں مصروف ہے۔ گیارہ دسمبر کو اقوام متحدہ نے جماعت الدعوہ پر پابندیاں عائد کر دیں۔ پاکستان کی حکومت نے بین الاقوامی دباؤ کے

تحت حافظ سعید کو گھر پر نظر بند کر دیا۔ تاہم بابو بجرنگی گجرات میں ضمانت پر ہے اور ایک معزز شخص کی حیثیت سے زندگی گزار رہا ہے۔ نسل کشی کے واقعات کے چند سال بعد وہ وی ایچ پی چھوڑ کر شیو سینا میں چلا گیا تھا۔ بجرنگی کا سابق مربی نریندر مودی اب بھی گجرات کا وزیر اعلیٰ ہے۔ جس شخص نے گجرات میں نسل کشی کی سرپرستی کی اسے اس کے بعد دو مرتبہ پھر منتخب کیا جا چکا ہے اور ہندوستان کے سب سے بڑے کارپوریٹ ہاؤس — ریلائنس اور ٹاٹا — اس کا گہرا احترام کرتے ہیں۔

سہیل سیٹھ، ٹی وی کے مشہور منتظم اور کارپوریٹ ترجمان، نے حال ہی میں کہا: "Modi is God." جن پولیس اہلکاروں نے گجرات میں ہلاکت اور لوٹ مار کرتے ہندو بلوائیوں کی نگرانی اور بعض موقعوں پر مدد بھی کی انھیں انعامات اور ترقیاں ملی ہیں۔ ہندوستان بھر میں آر ایس ایس کی پینتالیس ہزار شاخیں ہیں، اس کے زیر اہتمام چلنے والے خیراتی اداروں کی فہرست بہت لمبی ہے اور اس کے ستر لاکھ رضا کار اس کی نفرت کی مہم کا پرچار کرنے میں مصروف ہیں۔ ان رضا کاروں میں نریندر مودی بھی ہے، لیکن اس کے علاوہ سابق وزیر اعظم واجپئی اور حزب اختلاف کا موجودہ لیڈر آڈوانی، اور متعدد سینئر سیاست کار، بیوروکریٹ اور پولیس اور انٹیلی جنس کے اہلکار بھی شامل ہیں۔

اگر ہماری سیکولر جمہوریہ کی تصویر کو درہم برہم کرنے کے لیے اتنا کافی نہیں تو ہمیں یہ بات بھی ریکارڈ پر لانی چاہیے کہ ہندوستان میں بہت سی مسلمان تنظیمیں بھی ہیں جو اپنی تنگ نظر جنونیت پھیلانے میں مصروف ہیں۔

چنانچہ سب کچھ دیکھ بھال کر اگر مجھے فریق A اور فریق B میں سے ایک کو چننا ہو تو میں فریق B کو چنوں گی۔ ہمیں تناظر کی ضرورت ہے۔ ہمیشہ۔

اس نیوکلیئر برصغیر میں یہ تناظر 1947 میں ہونے والی تقسیم سے شروع ہوتا ہے۔ ریڈکلف کی لکیر جس نے ریاستوں، ضلعوں، گاؤوں، کھیتوں، برادریوں، آبپاشی کے نظاموں، گھروں اور خاندانوں کو تقسیم کر ڈالا، اسے راتوں رات کھینچا گیا تھا۔ یہ ہم پر برطانیہ کی آخری، الوداعی لات تھی۔ تقسیم کے نتیجے میں جو فسادات شروع ہوئے ان میں دس لاکھ سے زیادہ لوگوں کی جان گئی اور حالیہ تاریخ کی انسانی آبادی کی سب سے بڑی نقل مکانی ہوئی۔ اسّی لاکھ لوگ، ہندو نئے پاکستان سے اور مسلمان نئی قسم کے ہندوستان سے، اپنے گھر چھوڑ کر تن کے کپڑوں میں جان بچا کر بھاگنے پر مجبور

ہوئے۔

ان میں سے ہر شخص کے پاس ناقابل تصور اذیت، نفرت، دہشت کی ایک کہانی ہے جو اس سے اگلی نسل کو منتقل ہو رہی ہے، لیکن یہ کہانی آرزوؤں کی بھی ہے۔ وہ زخم، وہ پھٹ چکے لیکن اب تک اینٹھے ہوئے عضلات، وہ خون اور وہ ٹوٹی ہوئی ہڈیاں ہمیں اب تک ایک ایسی بغلگیری میں تھامے ہوئے ہیں جو نفرت اور دہشت ناک مانوسیت کے ساتھ ساتھ محبت کی بھی ہے۔ اس نے کشمیر کو ایک ایسے بھیانک خواب میں گرفتار چھوڑ دیا ہے جس سے وہ رہا نہیں ہو پا رہا، ایسا بھیانک خواب جس میں اب تک ساٹھ ہزار زندگیاں تلف ہو چکی ہیں۔ پاکستان، پاک لوگوں کا وطن، پہلے اسلامی جمہوریہ بنا، اور پھر سرعت کے ساتھ ایک بدعنوان، پرتشدد فوجی ریاست بن گیا جو دوسرے مذہبوں کے سلسلے میں کھلم کھلا عدم رواداری ہے۔ اس کے برعکس ہندوستان نے خود کو ایک شمولیت پسند، سیکولر جمہوریت قرار دیا۔ یہ ایک شاندار قدم تھا، لیکن بابو بجرنگی کے پیشرو 1920 سے سخت محنت کرتے ہوئے ہندوستان کے خون کے بہاؤ میں زہر ٹپکانے میں، ہندوستان کے خیال کو جنم لینے سے پہلے ہی تباہ کرنے میں مصروف رہے ہیں۔ 1990 تک آتے آتے وہ اتنے طاقتور ہو چکے تھے کہ اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کر سکیں۔ 1992 میں آڈوانی کے بھڑکائے ہوئے ہندو جنونیوں کے ہجوم نے بابری مسجد پر دھاوا بول کر اسے مسمار کر ڈالا۔ 1998 میں بی جے پی مرکز میں برسر اقتدار آ چکی تھی۔ امریکہ کی دہشت گردی کے خلاف جنگ نے ان لوگوں کے بادبانوں میں ہوا بھر دی۔ اس نے انھیں من مانی کرنے کا موقع دیا، یہاں تک کہ نسل کشی کا ارتکاب کر کے اسے انتشار زدہ جمہوریت کی ایک جائز شکل ٹھہرانے تک کا موقع دیا۔ یہ سب ایک ایسے وقت پر ہوا جب ہندوستان نے اپنی وسیع منڈی بین الاقوامی سرمائے کے لیے کھول دی تھی اور یہ اقدام عالمی کارپوریشنوں اور ان کی ملکیت میں چلنے والے میڈیا ہاؤسوں کے مفاد میں تھا، کیونکہ وہ ہندوستان کو ایک ایسے ملک کے طور پر پیش کرنا چاہتے تھے جہاں کچھ غلط ہو ہی نہیں سکتا۔ اس سے نہ صرف ہندو قوم پرستوں کو بڑھاوا ملا بلکہ وہ جواب دہی کے خطرے سے بھی محفوظ ہو گئے، جس کی انھیں ضرورت تھی۔

یہ ہے برصغیر میں دہشت گردی کا، چنانچہ ممبئی پر ہونے والے حملے کا، وسیع تر تاریخی تناظر۔ ہمیں اس پر حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ لشکرِ طیبہ کا حافظ سعید شملہ کا رہنے والا ہے اور آر ایس ایس کا

آڈوانی سندھ کا۔

جیسا کہ 2001 میں پارلیمنٹ پر حملے، 2002 میں سابرمتی ایکسپریس کی ایک بوگی کی آتش زنی اور 2007 میں سمجھوتہ ایکسپریس پر بم حملے کے بعد ہوا تھا، ہندوستانی حکومت نے اعلان کیا کہ اس کے پاس "ناقابلِ تردید" شواہد موجود ہیں کہ ممبئی حملے میں لشکرِ طیبہ کا ہاتھ ہے جس کی پشت پناہی پاکستانی آئی ایس آئی کر رہی ہے۔ لشکر نے اپنے ملوث ہونے کی تردید کی، لیکن اصل ملزم اب تک وہی ہے۔ پولیس اور انٹیلی جنس کے بیان کے مطابق لشکر ہندوستان میں انڈین مجاہدین نامی ایک تنظیم کے ذریعے کام کرتا ہے۔ دو ہندوستانی شہری، جموں و کشمیر پولیس کے لیے کام کرنے والا ایک سپیشل پولیس آفیسر شیخ مختار احمد اور مغربی بنگال کے شہر کولکاتا کا رہنے والا توصیف رحمٰن ممبئی حملوں کے سلسلے میں گرفتار کیے گئے ہیں۔

چنانچہ پاکستان پر سیدھا سیدھا لگنے والا الزام ابھی سے دھندلا پڑنے لگا ہے۔ تقریباً ہر بار جب بھی ایسی کہانیوں کی تہیں کھلتی ہیں تو پیادہ سپاہیوں، تربیت کاروں، بچولیوں اور خفیہ انٹیلی جنس اور کاؤنٹر انٹیلی جنس کارکنوں کا ایک جال پھیلا دکھائی دیتا ہے جو نہ صرف ہندوپاک سرحد کے دونوں طرف بلکہ بہت سے ملکوں میں بیک وقت کام کر رہے ہیں۔ آج کی دنیا میں کسی دہشت گرد حملے کے منبع کا تعین کرنا اور اسے کسی ایک ملک کی سرحد کے اندر محدود کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے کارپوریٹ دولت کے منبع کا سراغ لگانا۔ یہ قریب قریب ناممکن ہے۔

ایسے حالات میں دہشت گردی کے کیمپ تباہ کرنے کی غرض سے کیے جانے والے ہوائی حملوں سے کیمپ تو شاید تباہ ہو جائیں، لیکن دہشت گرد ہرگز ختم نہیں ہوں گے۔ اور جنگ بھی نہیں۔ (مزید یہ کہ ہمیں اعلیٰ اخلاقی مقام پر فائز کرنے کی اپنی کوشش میں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہمارے ہمسایہ ملک سری لنکا میں سرگرم لبریشن ٹائیگرز آف تمل ایلم (LTTE) کو، جو دنیا کا خوفناک ترین دہشت گرد گروپ ہے، ہندوستانی فوج نے تربیت دی تھی۔

پاکستان، جسے اتحادی کے طور پر پہلے افغان اسلام پسندوں کی حمایت میں امریکہ کی جنگ میں شامل ہونا پڑا اور پھر انھی اسلام پسندوں کے خلاف اس کی دوسری جنگ میں بھی، اور جس کا پورا رقبہ ان تضادات کے بوجھ تلے چرچرا رہا ہے، خانہ جنگی کی طرف جھکا چلا جا رہا ہے۔ سوویت یونین

کے خلاف امریکی جہاد کے لیے بھرتی ایجنٹ کے طور پر پاکستانی فوج اور آئی ایس آئی کو بنیاد پرست تنظیموں کو پروان چڑھانے اور انھیں امریکی فنڈ مہیا کرنے کی ذمے داری دی گئی تھی۔ ان عفریتوں میں جان ڈال کر انھیں دنیا پر چھوڑ دینے کے بعد امریکہ کو یہ بھی توقع تھی کہ جب وہ چاہے گا پالتو شکاری کتوں کی طرح ان کی لگام کھینچ کر انھیں قابو میں لے آئے گا۔

یہ توقع تو اسے بہرحال نہیں تھی کہ وہ گیارہ ستمبر کو ہوم لینڈ کے قلب میں در آئیں گے۔ چنانچہ جب ایسا ہوا تو افغانستان کو ایک بار پھر تشدد کے ذریعے نئے سرے سے بنانا ضروری ہو گیا۔ اب دوبارہ تباہ کیے ہوئے افغانستان کا ملبہ پاکستان کی سرحد تک چلا آیا ہے۔ کوئی شخص اس سے انکار نہیں کرتا، بشمول پاکستانی حکومت کے، کہ وہ ایک ایسے ملک کا انتظام چلانے پر مامور ہے جو اندر کی جانب پھٹنے کے شدید خطرے میں ہے۔ دہشت گردوں کے تربیتی کیمپ، آگ اگلتے ملّا اور جنونی، جن کو یقین ہے کہ دنیا پر اسلام کا تسلط ہو گا یا ہونا چاہیے، یہ سب دو افغان جنگوں کا ریزہ ریزہ ملبہ ہے۔ ان کا طیش پاکستانی حکومت اور پاکستانی شہریوں پر بھی اسی طرح، بلکہ شاید اس سے زیادہ شدت سے نازل ہو رہا ہے جس طرح ہندوستان پر۔

اگر اس موقعے پر ہندوستان نے جنگ چھیڑنے کا فیصلہ کیا تو شاید پورے خطے کے انتشار کی دلدل میں اترنے کا عمل مکمل ہو جائے گا۔ ایک دیوالیہ، تباہ شدہ پاکستان کا ملبہ ہندوستان کے ساحل پر آ کر جمع ہو جائے گا اور ہمیں ایسے خطرے میں ڈال دے گا جیسا اس سے پہلے کبھی درپیش نہیں ہوا۔ اگر پاکستان تباہ ہوا تو ہمیں اپنے پڑوسیوں کے طور پر لاکھوں "غیر ریاستی عناصر" کی توقع کرنی چاہیے جن کے قبضے میں نیوکلیئر اسلحہ بھی ہو گا۔ یہ سمجھنا دشوار ہے کہ ہندوستان کے جہاز کا سکان جن افراد کے ہاتھ میں ہے وہ پاکستان کی غلطیوں کو دہرانے اور امریکہ کو ہمارے انتہائی پیچیدہ معاملات میں بھونڈے پن سے دخل اندازی کرنے کی دعوت دے کر اپنے ملک پر تباہی لانے پر کیوں تلے بیٹھے ہیں۔ کسی سپر پاور کے اتحادی نہیں ہوتے — اس کے محض ایجنٹ ہوتے ہیں۔

مثبت پہلو کے طور پر، جنگ کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ یہ ہندوستان کے لیے ان مسائل کا سامنا کرنے سے بچنے کا بہترین طریقہ ہے جو اندرون ملک سنگین ہوتے جا رہے ہیں۔ چوبیس گھنٹے چلنے والے ہمارے سرِشتہ نیوز چینلوں (اور خدا جانے کتنے بین الاقوامی چینلوں) نے ممبئی کے حملوں کو لائیو

(اور exclusive) ٹیلی کاسٹ کیا۔ سٹوڈیو میں بیٹھے ٹی وی اینکروں اور ''گراؤنڈ زیرو'' پر موجود صحافیوں نے اپنی پُر جوش کمنٹری میں ذرا بھی وقفہ نہ آنے دیا۔ تین دن اور تین رات ہم بے یقینی کے عالم میں دیکھتے رہے کہ کس طرح اسلحے اور آلات سے مسلح نہایت نوعمر لڑکوں کے ایک چھوٹے سے ٹولے نے اس مفروضہ طور پر انتہائی طاقتور، نیوکلیئر اسلحے کی مالک سپر پاور کی پولیس، ایلیٹ نیشنل سکیورٹی گارڈز اور میرین کمانڈوز کی بے بسی کو پوری طرح آشکار کر دیا۔

ایسا کرتے ہوئے ان لڑکوں نے ریلوے سٹیشنوں، ہسپتالوں اور لگژری ہوٹلوں میں نہتے لوگوں کو بہیمانہ انداز سے، ان کے طبقے، ذات، مذہب یا قومیت سے بے نیاز ہو کر قتل کیا۔ (سکیورٹی فورسز کی بے بسی کی ایک وجہ یرغمالیوں کے بارے میں تشویش بھی تھی۔ کسی اور صورت حال میں، مثلاً کشمیر میں، ان کی حکمت عملی اتنی حساسیت پر مبنی نہیں ہوتی۔ پوری پوری عمارتوں کو بارود سے اڑا دیا جاتا ہے۔ انسانی ڈھال بے جھجک استعمال کی جاتی ہے۔ فلسطین، عراق اور افغانستان میں امریکی اور اسرائیلی فوجیں رہائشی عمارتوں میں کروز میزائل داغنے اور براتوں پر ڈیزی کٹر گرانے سے نہیں ہچکچا تیں۔) لیکن یہاں بات مختلف تھی۔ اور پھر اسے ٹی وی پر بھی تو دکھایا جا رہا تھا۔

قتل کرنے اور خود مارے جانے پر دہشت گرد لڑکوں کی بے پروا آمادگی نے ان کے بین الاقوامی ناظرین کو سحر زدہ کر دیا۔ ٹی وی دیکھنے والے خودکش بم دھماکوں اور میزائل حملوں کی جس روزمرہ خوراک کے عادی ہو گئے تھے، انھوں نے اس سے مختلف چیز پیش کی۔ اب ایک نیا منظر سامنے تھا۔ ڈائی ہارڈ 25۔ یہ دلخراش پرفارمنس جاری رہی اور ٹی وی کی ریٹنگ میں اضافہ ہوتا رہا۔ کسی بھی ٹیلیوژن میگنیٹ یا کارپوریٹ ایڈورٹائزر سے پوچھ لیجیے — جو منٹوں نہیں، سیکنڈوں کا حساب لگاتا ہے — کہ اس کی مالیت کیا ہو سکتی ہے۔

آخر کار قاتل مارے گئے اور بری طرح مارے گئے۔ (ممکن ہے ان میں سے کچھ افراتفری کا فائدہ اٹھا کر فرار بھی ہو گئے ہوں۔ ہمیں شاید اس کا پتا کبھی نہ چل پائے۔) اس پوری کشمکش کے دوران دہشت گردوں نے نہ کوئی مطالبہ کیا اور نہ مذاکرات کی خواہش ظاہر کی۔ ان کا مقصد لوگوں کو ہلاک کرنا اور خود مارے جانے سے پہلے زیادہ سے زیادہ ہلاکت پھیلانا تھا۔ انھوں نے پوری طرح ہماری سٹی گم کر دی۔ جب ہم کہتے ہیں: ''دہشت گردی کا کوئی جواز نہیں ہو سکتا،'' تو ہم میں سے بیشتر

کی مراد یہ ہوتی ہے کہ انسانی جان لینے کا کوئی جواز نہیں ہو سکتا۔ ہم یہ اس لیے کہتے ہیں کہ ہم زندگی کا احترام کرتے ہیں، کیونکہ ہم اسے قیمتی سمجھتے ہیں۔ تو پھر یہ لوگ ہماری سمجھ میں کیونکر آئیں جنھیں زندگی کی — خواہ وہ ان کی اپنی ہی کیوں نہ ہو — کوئی پروا نہیں؟ سچ یہ ہے کہ ہم قطعی نہیں جانتے کہ ان لوگوں کو کیونکر سمجھا جائے، کیونکہ ہم محسوس کر سکتے ہیں کہ موت سے ہم کنار ہونے سے پہلے ہی یہ لوگ ایک ایسی دنیا میں پہنچ چکے ہیں جہاں ہم ان تک نہیں پہنچ سکتے۔

ایک ٹی وی چینل (انڈیا ٹی وی) نے حملہ آوروں میں سے ایک کے ساتھ، جس نے اپنا تعارف عمران بابر کے نام سے کرایا، ٹیلیفون پر بات چیت نشر کی۔ میں اس گفتگو کے حقیقی ہونے کی تصدیق نہیں کر سکتی لیکن اس نے جو کچھ کہا وہ وہی تھا جو دہشت کے ان ای میل پیغامات میں درج تھا جو ہندوستان کے کئی شہروں میں ہونے والے بم دھماکوں سے پہلے جاری کیے گئے تھے۔ یہ وہی چیزیں ہیں جن کے بارے میں بات کرنا ہم اب پسند نہیں کرتے: 1992 میں بابری مسجد کی مسماری، 2002 میں گجرات میں مسلمانوں کی نسل کشی، کشمیر میں بہیمانہ جبر۔ ''تم گھیرے میں آ چکے ہو،'' ٹی وی اینکر نے حملہ آور سے کہا۔ ''تمھارا مارا جانا یقینی ہے۔ تم ہتھیار کیوں نہیں ڈال دیتے؟''

''مرتے تو ہم روزانہ ہیں،'' اس نے ایک عجیب، میکانیکی انداز سے جواب دیا۔ ''ایک دن شیر کی طرح زندہ رہ کر یوں مرنا بہتر ہے۔'' اس کی باتوں سے ایسا نہیں لگتا تھا کہ وہ دنیا کو تبدیل کرنا چاہتا ہے۔ وہ دنیا کو اپنے ساتھ ہلاکت کے گڑھے میں لے جانے کا خواہشمند معلوم ہوتا تھا۔

اگر یہ افراد واقعی لشکرِ طیبہ کے رکن تھے تو انھیں اس بات کا خیال کیوں نہیں آیا کہ مارے جانے والوں میں سے بہت سے مسلمان ہیں؟ یا یہ کہ جن مسلمانوں کے حقوق کے لیے وہ لڑنے کا دعویٰ کر رہے ہیں ہندوستان میں اس حملے کے ہونے والے ردعمل میں انھیں سنگین نقصان اٹھانا پڑ سکتا ہے؟ دہشت گردی ایک سنگ دل نظریہ ہے، اور بیشتر نظریوں کی طرح، جن کی نگاہ وسیع تر مجموعی تصویر پر جمی رہتی ہے، انسان انفرادی طور پر ان کے حساب کتاب میں سوائے ضمنی تباہی (collateral damage) کے کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ یہ دہشت گردی کی سرگرمی کا حصہ ہی نہیں بلکہ اس کا مقصد رہا ہے کہ کسی خراب صورتحال کو مزید بگاڑ کر اس میں زیرِ زمین چھپی دراڑوں کو ظاہر کیا جائے۔ ''شہیدوں'' کا خون دہشت گردی کی آبیاری کرتا ہے۔ ہندو دہشت گردوں کو ہندو لاشیں درکار ہوتی

ہیں، کمیونسٹ دہشت گردوں کو پرولتاریوں کی لاشیں، اسلام پسند دہشت گردوں کو مسلمانوں کی لاشیں۔ یہ لاشیں مظلومیت کا نشان، اس کی شہادت، اس کا ثبوت بن جاتی ہیں، جو اس منصوبے کا مرکزی حصہ ہے۔ دہشت گردی کی کسی واحد کارروائی سے فوجی فتح حاصل کرنا مقصود نہیں ہوتا؛ زیادہ سے زیادہ اس سے ایک عمل انگیز (catalyst) کے طور پر موثر ہونے کی توقع کی جاتی ہے، تاکہ وہ کسی اور شے کو مہمیز کر سکے، کسی ایسی شے کو جو موجودہ کارروائی سے کہیں زیادہ بڑی ہو، یعنی زیرِ زمین چٹانوں کو حرکت میں لا کر زلزلہ پیدا کر سکے۔ دہشت گردی کی کارروائی بجائے خود ایک تھیٹر ہوتی ہے، ایک قابلِ دید منظر اور ایک علامت سازی، اور آج وہ جس سٹیج پر اپنے چکردار رقص اور اپنی حیوانی کارروائی کا مظاہرہ کر رہی ہے وہ لائیو ٹیلیوژن کا سٹیج ہے۔ اس وقت بھی جب ٹی وی اینکر ان حملوں کی مذمت کر رہے تھے، دہشت گردی کی کارروائی کو ٹی وی پر ہزار گنا بڑا کر کے پیش کیا جا رہا تھا۔

ٹی وی تجزیوں کے بے شمار گھنٹوں اور لاتعداد اخباری مضامین میں، کم سے کم ہندوستان میں، کمرے میں موجود ہاتھیوں جیسے حقائق — کشمیر، گجرات، بابری مسجد کی مسماری — کا بمشکل ہی کہیں ذکر آیا۔ اس کے بجائے ریٹائرڈ سفارت کار اور حکمت عملی کے ماہرین پاکستان کے خلاف جنگ چھیڑنے کے فوائد اور نقصانات پر بحث کرتے رہے۔ ہم نے مالدار لوگوں کو یہ دھمکی دیتے دیکھا کہ اگر ان کی سلامتی کی ضمانت نہ دی گئی تو وہ ٹیکس دینا بند کر دیں گے (گویا غریبوں کا غیر محفوظ رہنا کوئی غلط بات نہیں)۔ ہم نے لوگوں کی زبان سے اس قسم کی تجویزیں سنیں کہ حکومت دستبردار ہو جائے اور ہندوستان کی ہر ریاست کو ایک الگ کارپوریشن کے حوالے کر دیا جائے۔ ہم نے دیکھا کہ دلتوں اور نچلی ذاتوں کے ہیرو اور اونچی ذاتوں کے ولن سابق وزیر اعظم وی پی سنگھ کی موت کی خبر کو کس طرح نظر انداز کر دیا گیا۔

ہم نے *Maximum City* کے مصنف اور بالی وڈ کی فلم مشن کشمیر کے شریک مصنف سکیتو مہتہ کو جارج بش کی مشہور تقریر "Why they hate us" کا اپنا روپ پیش کرتے ہوئے دیکھا۔ مذہبی جنونی — ہندو اور مسلمان، دونوں قسم کے — ممبئی شہر سے کیوں نفرت کرتے ہیں؟ اس بارے میں سکیتو مہتہ کا تجزیہ یہ ہے: ''شاید اس لیے کہ ممبئی بے حساب دولت کمانے کے دیدہ دلیر خوابوں اور بلاامتیاز کھلے پن کا شہر ہے۔'' تو پھر اس نفرت کا جواب کیا ہو؟ وہ کہتا ہے:

"دہشت گردوں کو بہترین جواب یہ ہوگا کہ اَور زیادہ بڑے خواب دیکھے جائیں، اَور زیادہ دولت کمائی جائے، اور ہمیشہ سے بڑھ کر ممبئی کے سفر پر آیا جائے۔" کیا جارج بش نے بھی نائن الیون کے بعد امریکیوں سے یہی نہیں کہا تھا کہ انھیں باہر نکل کر خوب شاپنگ کرنی چاہیے؟ آہ، نائن الیون! وہ دن جس سے پیچھا چھڑانا ہمارے لیے ناممکن سا ہو گیا ہے۔

اگرچہ ممبئی میں ہولناکی کا ایک باب ختم ہو گیا ہے، لیکن دوسرے باب کا شاید آغاز ہو رہا ہے۔ ہر روز ہندوستانی اشرافیہ کا ایک طاقتور، پُرشور حصہ، غارتگر ٹی وی اینکروں کی شہ پا کر، جن کے مقابلے میں فاکس نیوز تقریباً ریڈیکل اور بائیں بازو کا معلوم ہونے لگا ہے، سیاست کاروں پر، تمام سیاست کاروں پر، اندھادھند برستے ہیں، پولیس اور فوج کی مدح سرائی کرتے ہیں اور پولیس سٹیٹ کے قیام کا باقاعدہ مطالبہ کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ جو لوگ جمہوریت کے (جیسی تیسی بھی وہ ہے) پھل کھا کر فربہ ہوئے ہیں وہی اب پولیس سٹیٹ کے آرزومند ہیں۔ "پھل چننے" کا دور عرصہ ہوا ختم ہو چکا۔ اب ہم زبردستی ہتھیانے کے دور میں ہیں، اور جمہوریت کو اس عمل میں حائل ہونے کی ناگوار عادت ہے۔

پولیس اچھی، سیاست دان برے/فوج اچھی حکومت خراب/ ہندوستان اچھا پاکستان برا— ایسے خطرناک اور احمقانہ فلیش کارڈ، ہر ٹیلیوژن چینل پر کھلم کھلا دکھائے جا رہے ہیں اور ان چینلوں نے اپنے ناظرین کو ایک بے قابو ہسٹیریا میں مبتلا کر ڈالا ہے۔

المناک بات یہ ہے کہ عقل کی یہ شیرخوارگی ایک ایسے وقت پر سامنے آ رہی ہے جب ہندوستان کے لوگوں کو یہ دکھائی دینے لگا تھا کہ دہشت گردی کے کاروبار میں مظلوم اور ظالم کبھی کبھی ایک دوسرے سے جگہیں بدل لیتے ہیں۔ یہ ایسی فہم ہے جسے کشمیر کے لوگوں نے، پچھلے بیس برس کے اپنے ہولناک تجربے کے نتیجے میں، مانجھ مانجھ کر ایک فنِ لطیف کی شکل دے لی ہے۔ باقی ہندوستان میں ہم ابھی اسے سیکھ رہے ہیں۔ (اگر کشمیر اپنی مرضی سے ہندوستان سے متحد نہیں ہوتا تو معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کشمیر سے متحد/منتشر ہو جائے گا۔)

یہ صرف 2001 کے پارلیمنٹ پر حملے کے بعد ہوا کہ کچھ سنجیدہ سوالات اٹھائے جانے لگے۔ وکیلوں اور سیاسی کارکنوں کے ایک گروپ نے اس کا پردہ فاش کیا کہ کس طرح پولیس اور پریس نے

بے قصور لوگوں کو مجرم ٹھہرا دیا، کس طرح جعلی شہادتیں گھڑی گئیں، گواہوں نے کیسے جھوٹی گواہیاں دیں اور تفتیش کے ہر مرحلے پر قواعد وضوابط کی کس کس طرح مجرمانہ خلاف ورزیاں کی گئیں۔ آخر کار عدالتوں نے چار میں سے دو ملزموں کو، بشمول ایس اے آر گیلانی، جسے پولیس نے پوری کارروائی کا ماسٹر مائنڈ قرار دیا تھا، بری کر دیا۔ تیسرے ملزم شوکت گرو کو بھی اس پر لگائے گئے تمام الزامات سے بری کر دیا گیا لیکن ایک نئے، نسبتاً چھوٹے جرم میں اسے سزا سنائی گئی۔ ایک ملزم محمد افضل کی سزائے موت کو سپریم کورٹ نے بحال رکھا۔ اپنے فیصلے میں عدالت نے تسلیم کیا کہ ایسی کوئی شہادت دستیاب نہیں ہے کہ محمد افضل کسی دہشت گرد گروپ سے وابستہ تھا، لیکن اس کے بعد یہ صدمہ انگیز الفاظ بھی لکھے کہ "معاشرے کا مجموعی ضمیر صرف اسی صورت میں تسکین پا سکتا ہے کہ مجرم کو سزائے موت دی جائے۔" آج بھی دراصل ہم نہیں جانتے کہ ہندوستانی پارلیمنٹ پر حملہ کرنے والے کون لوگ تھے اور کس کے لیے کام کر رہے تھے۔

ابھی حال ہی میں، ستمبر 2008 میں، جامعہ نگر، دہلی، کے محلے بٹلہ ہاؤس میں ایک متنازع پولیس مقابلہ ہوا جس میں دہلی پولیس کے سپیشل سیل نے دو مسلمان طالب علموں کو ان کے کرائے کے فلیٹ کے اندر گھس کر بے حد قابل اعتراض حالات میں گولیاں مار کر قتل کر دیا اور دعویٰ کیا کہ وہ اس سال دہلی، جے پور اور احمد آباد میں ہونے والے بم دھماکوں کے لیے ذمے دار تھے۔ ایک اسسٹنٹ کمشنر پولیس موہن چند شرما جس نے پارلیمنٹ پر حملے کی تفتیش میں اہم کردار ادا کیا تھا، وہ بھی اس واقعے میں ہلاک ہوا۔ وہ ہندوستان کے متعدد "انکاؤنٹر سپیشلسٹوں" میں سے ایک تھا جسے کئی "دہشت گردوں" کو سرسری کارروائی میں ہلاک کر ڈالنے کا صلہ شہرت اور انعامات کی شکل میں ملا۔ محلے میں رہنے والے عینی گواہوں کے علاوہ کانگریس پارٹی کے سینئر رہنماؤں، طالب علموں، صحافیوں، وکیلوں، استادوں اور سیاسی کارکنوں کی طرف سے سپیشل سیل کے خلاف احتجاج کی آوازیں اٹھیں، جن میں سے ہر ایک نے اس واقعے کی عدالتی تحقیقات کا مطالبہ کیا۔ اس کے جواب میں بی جے پی اور ایل کے آڈوانی نے موہن چند شرما کو ایک "بہادر سورما" کہہ کر سراہا اور ان لوگوں کے خلاف ایک منظم مہم شروع کر دی جنھوں نے پولیس کی ایمانداری پر شبہ کرنے کی جرأت کی تھی؛ اس نے پولیس کے بیان پر شبہ کرنے والوں کو "قوم دشمن" قرار دیا اور یہ کہا کہ ان کا موقف "خودکشی پر مائل" ہے۔ ظاہر ہے کہ

اس واقعے کی اب تک کوئی تحقیقات نہیں ہوئی ہے۔

بٹلہ ہاؤس والی واردات کے چند روز بعد "دہشت گردوں" کے بارے میں ایک اور کہانی خبروں میں سامنے آئی۔ سیشن کورٹ میں داخل کرائے گئے ایک بیان میں سنٹرل بیورو آف انوسٹی گیشن (CBI) نے کہا کہ دسمبر 2005 میں دہلی کے اسپیشل سیل کی ایک ٹیم نے (وہی ٹیم جس نے بٹلہ ہاؤس کے پولیس مقابلے کا اہتمام کیا اور جس میں موہن چند شرما بھی شامل تھا) دو بے گناہ افراد، ارشاد علی اور معارف قمر، کو اغوا کیا، ان پر دو کلوگرام آر ڈی ایکس اور دو پستول کی برآمدگی مڑھی اور پھر انھیں کشمیر میں کارروائیاں کرنے والے ایک گروپ البدر سے تعلق رکھنے والے "دہشت گرد" قرار دے کر گرفتار کرلیا۔ ارشاد اور معارف، جو کئی برس سے جیل میں پڑے ہیں، ان سینکڑوں مسلمانوں میں سے صرف دو مثالیں ہیں جنھیں اسی طرح قید میں ڈالا گیا، ایذا دہی کا نشانہ بنایا گیا، حتیٰ کہ جھوٹے الزام لگا کر ہلاک تک کیا گیا ہے۔

اس جانے پہچانے سلسلے میں تبدیلی اس وقت دکھائی دی جب مہاراشٹر کے اینٹی ٹیررسٹ اسکواڈ (ATS) نے، جو ستمبر 2008 میں مالیگاؤں میں ہونے والے بم دھماکوں کی تفتیش کر رہا تھا، ایک ہندو سادھوی پرگیہ اور ایک خود ساختہ گرو سوامی دیانند پانڈے اور ہندوستانی فوج کے ایک حاضر سروس افسر لیفٹیننٹ کرنل پروہت کو گرفتار کیا۔ گرفتار ہونے والے یہ تمام افراد ہندو قوم پرست تنظیموں سے تعلق رکھتے تھے جن میں ہندو غلبے کے لیے کام کرنے والا ایک گروپ ابھینو بھارت بھی شامل تھا۔ شوسینا، بی جے پی اور آر ایس ایس نے مہاراشٹر اے ٹی ایس کی مذمت کی، اس کے سربراہ ہیمنت کرکرے پر سیاسی سازش میں ملوث ہونے کا الزام لگایا اور اعلان کیا کہ "ہندو دہشت گرد نہیں ہو سکتے"۔ آڈوانی نے پولیس کے ہر شک شبے سے بالاتر ہونے کے بارے میں اپنی پالیسی میں تبدیلی پیدا کی اور بڑے بڑے اجتماعات میں اشتعال انگیز تقریریں کیں جن میں اس نے متبرک مردوں اور عورتوں کے بارے شکوک پیدا کرنے پر اے ٹی ایس کی مذمت کی۔

25 نومبر کے اخباروں میں یہ رپورٹ چھپی کہ اے ٹی ایس مالیگاؤں بم دھماکوں میں ممکنہ طور پر ملوث ہونے کے سلسلے میں وشو ہندو پریشد کے سربراہ پروین توگڑیا کے بارے میں تحقیقات کر رہا ہے۔ اگلے دن، قسمت کے ایک غیر معمولی پھیر سے، ہیمنت کرکرے ممبئی حملوں میں ہلاک ہو گیا۔

امکانات یہ ہیں کہ اے ٹی ایس کے اگلے سربراہ کے لیے، خواہ وہ کوئی بھی ہو، اس سیاسی دباؤ کی مزاحمت کرنا نہایت دشوار ہوگا جس کا مالیگاؤں دھماکوں کے سلسلے میں ڈالا جانا یقینی ہے۔

اگرچہ سنگھ پریوار اس سلسلے میں ابھی کسی واضح نتیجے پر پہنچتا دکھائی نہیں دے رہا کہ اب پولیس کی کارروائی پر اعتراض کرنا قوم دشمنی اور خودکشی پر مائل ہونا ہے یا نہیں، لیکن ٹائمز ناؤ ٹی وی چینل کے اینکر پرسن ارنب گوسوامی نے بہرحال اس جانب ایک قدم بڑھا دیا ہے۔ اس نے باقاعدہ نام لے کر شرانگیز الزامات لگانا اور پولیس اور مسلح افواج کی ایمانداری پر کوئی اعتراض اٹھانے والے لوگوں کو کھلم کھلا دھمکانا شروع کر دیا ہے۔ میرا اور معروف وکیل پرشانت بھوشن کا نام کئی بار لیا گیا ہے۔ ایک موقعے پر، ایک سابق پولیس افسر کا انٹرویو کرتے ہوئے، ارنب گوسوامی نے کیمرے کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا، ''ارندھتی رائے اور پرشانت بھوشن! امید ہے تم لوگ بھی سن رہے ہوگے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ تم گھناؤنے لوگ ہو۔'' آج جس قسم کا جنونی اور ہیجان خیز ماحول ہے، اس میں ایک ٹی وی اینکر کی جانب سے اس قسم کی بات دھمکی بھی ہے اور لوگوں کو ہمارے خلاف بھڑکانے کی کوشش بھی، اور کسی اور قسم کے حالات میں اس کا نتیجہ اس صحافی کی ملازمت سے علیحدگی کی صورت میں نکل سکتا تھا۔

چنانچہ وہ شخص جو ہندوستان کا اگلا وزیراعظم بننے کا خواہشمند ہے، اور وہ جو ایک مین اسٹریم ٹی وی چینل کا نمائشی چہرہ ہے، دونوں کا موقف یہ ہے کہ شہریوں کو پولیس کے بارے میں کسی قسم کے سوالات اٹھانے کا کوئی حق نہیں۔ اور یہ بات ایک ایسے ملک میں کہی جا رہی ہے جو مشتبہ دہشت گرد حملوں، مشکوک تفتیشوں، اور جعلی ''مقابلوں'' کی ایک نیم تاریک تاریخ رکھتا ہے۔ ایک ایسا ملک جہاں پولیس کی حراست میں ہونے والی ہلاکتوں کی تعداد دنیا بھر میں سب سے زیادہ ہے اور اس کے باوجود وہ ایذارسانی کے خلاف بین الاقوامی معاہدے پر دستخط کرنے سے انکاری ہے۔ ایک ایسا ملک جہاں اذیت گاہوں تک پہنچنے والے لوگ خوش قسمت سمجھے جاتے ہیں کہ کم سے کم وہ ہمارے ''انکاؤنٹر سپیشلسٹوں'' کے ہاتھوں ''مقابلے'' میں ہلاک کر دیے جانے سے بچ نکلے۔ ایک ایسا ملک جہاں انڈر ورلڈ اور انکاؤنٹر سپیشلسٹوں کے درمیان کوئی حدِ فاصل وجود نہیں رکھتی۔

ہم میں سے وہ لوگ جن کے دل ان تمام باتوں کے علم کے باعث مریض ہو چکے ہیں، ممبئی حملوں کو کس طرح دیکھیں اور ان کے بارے میں کیا کریں؟ ایک طرف ایسے لوگ ہیں جن کا خیال

ہے کہ امریکہ کی حکمت عملی اس اعتبار سے کامیاب رہی ہے کہ نائن الیون کے بعد سے اس کی سرزمین پر کوئی اور حملہ نہیں ہوا۔ تاہم دوسری طرف ایسے لوگ بھی ہیں جن کے خیال میں امریکہ اب اس سے بدتر حالت سے گزر رہا ہے۔ اگر نائن الیون کے دہشت گرد حملوں کا مقصد یہ تھا کہ امریکہ کو اپنے اصل رنگ میں سامنے آنے پر اکسایا جائے، تو اس مقصد میں اس سے بڑی کامیابی کیا ہو سکتی ہے؟ امریکی فوج دو ایسی جنگوں میں الجھ گئی ہے جن کا جیتا جانا ممکن نہیں اور جنھوں نے امریکہ کو دنیا کا سب سے نفرت انگیز ملک بنا دیا ہے۔ ان جنگوں نے امریکی معیشت کے اُدھڑنے کے عمل میں کلیدی کردار ادا کیا ہے اور کون جانے، شاید امریکی ایمپائر کی شکست بھی انھی کے نتیجے میں واقع ہو۔ (کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ بمباری اور ہلاکت کا شکار افغانستان، جو روس کا قبرستان بنا تھا، اس دوسری ایمپائر کے خاتمے کا بھی سبب بن جائے؟) ہزاروں امریکی سپاہیوں سمیت لاکھوں افراد عراق اور افغانستان میں ہلاک ہو چکے ہیں۔ باقی دنیا میں امریکی اتحادیوں/ ایجنٹوں (بشمول ہندوستان) پر اور امریکی مفادات پر ہونے والے دہشت گرد حملوں کی تعداد میں نائن الیون کے بعد سے ڈرامائی اضافہ ہو گیا ہے۔ جارج بش، جس نے نائن الیون کے امریکی ردعمل کی قیادت کی، نہ صرف بین الاقوامی طور پر بلکہ امریکی عوام کی نظر میں بھی ایک مکروہ کردار بن کر رہ گیا ہے۔ کون ہے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ امریکہ دہشت گردی کے خلاف جنگ جیت رہا ہے؟

امریکہ میں ہوم لینڈ سکیورٹی پر کئی بلین ڈالر خرچ آیا ہے۔ دنیا میں بہت کم ملک ایسے ہیں، ہندوستان تو ہرگز نہیں، جو اس قسم کے خرچ کا بوجھ اٹھا سکیں۔ اور اگر ہم اٹھا بھی سکتے، حقیقت یہ ہے کہ ہمارا ہوم لینڈ اس طریقے سے محفوظ نہیں بنایا جا سکتا، نہ پولیس کی ہمہ گیر نگرانی میں رہ سکتا ہے جیسا امریکہ میں ہوا ہے۔ یہ اس قسم کا ہوم لینڈ ہے ہی نہیں۔ ہمارے پڑوس میں نیوکلیئر ہتھیاروں سے مسلح ایک دشمن ریاست موجود ہے جو رفتہ رفتہ قابو سے باہر ہوتی جا رہی ہے، کشمیر میں ہمارا فوجی قبضہ ہے اور 15 کروڑ سے زیادہ کی مسلمان آبادی ہے جسے شرمناک طریقے سے زیادتیوں کا نشانہ بنایا اور غریب کیا جاتا رہا ہے اور جسے بطور گروہ ہدف بنا کر دیوار سے لگا دیا گیا ہے، جس کے نوجوانوں کو افق پر انصاف کا کوئی نشان دکھائی نہیں دیتا اور جو امید ترک کر کے اگر شدت پسندی اختیار کر لیں تو صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کو خطرے میں ڈال سکتے ہیں۔ اگر دس افراد این ایس جی کمانڈوز اور

پولیس کو تین دن تک الجھائے رکھ سکتے ہیں، اور اگر وادی کشمیر کو دبا کر رکھنے کے لیے پانچ لاکھ سپاہیوں کی ضرورت پڑتی ہے، تو آپ خود حساب کر لیجیے۔ کس قسم کی ہوم لینڈ سیکیورٹی ہو سکتی ہے، جو ہندوستان کو تحفظ فراہم کر سکے؟

اور کوئی جلد اثر حل بھی موجود نہیں ہے۔ دہشت گردی کے خلاف بنائے جانے والے قوانین دہشت گردوں کے لیے نہیں ہوتے؛ وہ ان لوگوں کے لیے ہوتے ہیں جنھیں حکومتیں ناپسند کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان قوانین کے ذریعے سزا تک پہنچنے والوں کا تناسب دو فیصد سے کم ہے۔ یہ قوانین صرف ناپسندیدہ افراد کو لمبی مدت تک ضمانت کے بغیر قید میں رکھنے اور پھر رہا کر دینے کے لیے ہیں۔ ضمانت سے محرومی یا آخرکار پھانسی پانے کا امکان ممبئی پر حملہ آور ہونے والے دہشت گردوں جیسے لوگوں کو جرم سے باز نہیں رکھ سکتا۔ یہی تو وہ شے ہے جو انھیں درکار ہے۔

جو کچھ ہمارے سامنے آ رہا ہے وہ عشروں تک اختیار کیے جانے والے جلد اثر حلوں اور غلیظ ہتھکنڈوں کا مجموعی نتیجہ ہے۔ قالین ہمارے پیروں کے نیچے دلدل بنا جا رہا ہے۔

دہشت گردی کو محدود کرنے کا واحد طریقہ (اسے ختم کرنے کی بات تو سادہ لوحی ہوگی) یہ ہے کہ ہم آئینے میں اپنی صورت دیکھیں۔ ہم ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں سے آگے راستہ دو شاخہ ہو گیا ہے۔ ایک طرف جانے والی تختی پر لکھا ہے: ''انصاف''، اور دوسرے پر ''خانہ جنگی''۔ کوئی تیسری تختی موجود نہیں، اور واپس لوٹنا ناممکن ہے۔ ہمیں اپنا راستہ چننا ہے۔

❁❁

ایٹم بم انسان کے ہاتھوں وجود میں آنے والی سب سے زیادہ جمہوریت دشمن، قوم دشمن، انسان دشمن، اور شیطانی چیز ہے۔
اگر آپ مذہب پر یقین رکھتے ہیں تو یاد رکھیے کہ ایٹم بم انسان کی طرف سے خدا کو دیا جانے والا چیلنج ہے۔
اس چیلنج کے الفاظ بالکل سادہ ہیں: تو نے جو کچھ بنایا ہے اسے ہم تباہ کرنے کی طاقت رکھتے ہیں۔
اگر آپ مذہبی نہیں ہیں تو اس کو یوں دیکھ سکتے ہیں:
ہماری دنیا چار ارب ساٹھ کروڑ سال پرانی ہے۔
اور یہ محض ایک سہ پہر میں تباہ کی جا سکتی ہے۔

ارندھتی رائے (پ 1961) اپنے ناولوں کے لیے اتنی ہی معروف ہیں جتنی اپنے مضامین کے لیے جو عوامی اہمیت کے متنوع موضوعات کو زیر بحث لاتے ہیں اور ان کے بارے میں پڑھنے والوں کی آگاہی میں اضافہ کرتے ہیں۔ ان کے دوسرے ناول The Ministry of Utmost Happiness کا ترجمہ بے پناہ شادمانی کی مملکت 2018 میں شائع ہوا۔ پہلے ناول The God of Small Things کا ترجمہ جاری ہے اور مکمل ہونے پر آج کی کتابیں کے زیر اہتمام شائع کیا جائے گا۔